حکمت کلیمی

ظفر احمد صدیقی

حکمتِ کلیمی

ظفر احمد صدیقی

طبع اول ایک ہزار

جنوری ۱۹۵۵ء

نقش ثانی

۱

ناشر

یونیورسٹی پبلشرز، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

قیمت :- دو روپیہ آٹھ آنے

۲/۸ روپے

حکمتِ کلیمی

یعنی

اقبالؔ کی مثنوی

پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق

کا منظوم اردو ترجمہ

مع مقدمہ

ظفرؔ احمد صدیقی

انتساب

اُس مردِ حُر کے نام

مشرق کی شبِ تار کو جس کا

انتظار ہے

ظفر احمد صدیقی

(مطبوعہ کمال پرنٹنگ پریس نئی سڑک دہلی)

ترتیب

نمبر شمار	مضمون		صفحہ
ا	دیباچہ	از مترجم	۷
ب	مقدمہ	"	۱۱
	مثنوی کی اہمیت	"	
	مثنوی کی زبان اور آرٹ	"	
	اقبال کا عام فلسفہ	"	
	مثنوی کا پیغام اور فلسفہ	"	
	حکمت کلیمی (منظوم ترجمہ اقبال)		
۱	کتاب پڑھنے والے سے		۴۹
۲	تمہید		۵۰
۳	مہر عالم تاب سے خطاب		۵۶

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۴	حکمت کلیمی	۵۹
۵	حکمت فرعونی	۶۳
۶	لا الٰہ الا اللہ	۶۶
۷	فقر	۷۰
۸	مردِ حُر	۷۹
۹	اسرار شریعت	۸۳
۱۰	ہندیوں کے افتراق پر چند آنسو	۸۹
۱۱	سیاسیات حاضرہ	۹۲
۱۲	اُمّتِ عربیہ سے خطاب	۹۸
۱۳	اقوامِ مشرق کے لئے راہِ عمل	۱۰۴
۱۴	حضورِ رسالت مآبؐ میں	۱۱۲

دیباچہ

سنہ ۱۹۳۸ء کے اواخر کا ذکر ہے کہ ایک ادبی مجلس میں تقریر کے لئے میں موضوع کی تلاش میں تھا۔ میرے محترم بزرگ اور شفیق استاد عمر الدین صاحب نے (جو اب شعبۂ فلسفہ و نفسیات کے صدر ہیں) مجھے مشورہ دیا کہ میں اقبال کی مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق"[1] کو اپنی تقریر کا موضوع بناؤں۔ یہ مثنوی اس وقت نئی نئی پبلک کی ہاتھوں میں پہنچی تھی۔ میں نے ذوق و شوق سے مثنوی کا مطالعہ شروع کیا۔ ایک بار پڑھا۔ دو بار پڑھا۔ بار بار پڑھا۔ مگر سیری نہ ہوئی۔ آنکھیں پرنم، جذبات متلاطم، ذہن مسحور اور دل اس کی کیفیتوں میں کھویا ہوا۔ اس عالم میں شرح و تفسیر کا سوال تو آیا گیا ہوا۔ لیکن جی چاہا کہ اس مائدۂ نعمت کی لذت سے اردو داں اصحاب بھی آشنا ہوتے۔ طبیعت میں تحریک اور ہیجان تھا ہی، ذرا سا اشارہ ملتے ہی اُبل پڑا اور فارسی اشعار اردو کا جامہ پہننے لگے۔ چند روز کے اندر مثنوی کا کافی حصہ اردو نظم میں منتقل ہو چکا تھا۔ پھر بعض افکار و مشاغل کی بنا پر یہ سلسلہ منقطع رہا۔ اس کے بعد اپنی ایک طویل علالت کے دوران میں، جب طبیعت کو ایک قسم کی یکسوئی حاصل تھی پھر اس طرف توجہ ہوئی اور سنہ ۱۹۳۹ء

---

[1] یعنی اے اقوام مشرق اب کیا کرنا چاہیے۔

کے وسط تک اس مبارک کام کی تکمیل ہو گئی۔ ۱۹۳۸ء سے اس وقت تک ایک طویل مدت گذر چکی ہے۔ اس تاخیر کی ذمہ دار کچھ تو طباعت وغیرہ کی دقتیں تھیں اور کچھ میری سہل انکاری بہرحال اس وقفہ سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ مجھے اپنی اس کوشش کو اپنے بہت سے فاضل دوستوں اور اردو کے بعض مایۂ ناز نقادوں کے سامنے پیش کرنے کا موقع مل گیا۔ جنکی راؤں اور مفید مشوروں کا میں شکر گذار ہوں۔ خاص طور سے میں جناب عمرالدین صاحب کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں جنھوں نے پوری کتاب کو اور بالخصوص مقدمے کے فلسفیانہ حصہ کو بالاستیعاب پڑھنے کی زحمت گوارا فرمائی اور اپنے قیمتی مشوروں سے مجھے ممنون فرمایا۔

ممکن ہے کسی کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو کہ مثنوی "پس چہ باید کرد" کا مقصد وقتی اور ہنگامی تھا۔ یہ اس وقت لکھی گئی تھی جب ہندوستان اور اکثر ممالک ایشیا انگریزی اقتدار کے زیر اثر تھے۔ اب صورت حال کافی بدل چکی ہے۔ اب اس مثنوی کی اشاعت ایک سرد دبے محل کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن یہ اعتراض مثنوی کے متعلق غلط فہمی پر مبنی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ایشیائی ممالک ظاہری طور پر تو آزاد ہو چکے ہیں لیکن ابھی مغرب کی سیاسی اور اقتصادی نیاز مندی کے دام سے رہا نہیں ہوئے ہیں۔ ابھی ایشیا اس قابل نہیں ہوا ہے کہ عالمی سیاست میں اپنی اخلاقی اور روحانی قدروں کو منوا سکے۔ اس لئے اقبال کا پیغام اب بھی وہی اہمیت اور افادیت رکھتا ہے جو اس کو پہلے حاصل تھی۔ دوسرے مثنوی سیاست دینی کے اصول اور فلسفہ سے بحث کرتی ہے جس کی اہمیت وقت اور جگہ کی پابند نہیں۔ جب کبھی اور جہاں کہیں کوئی قوم محکوم اور مظلوم ہوگی اور سوسائٹی کی بنیادیں ظلم و جور پر قائم ہوں گی۔ وہیں یہ اصول حریت اور نئی تعمیر انسانیت کا پیغام دیں گے۔

اب نفس ترجمہ کے متعلق چند امور کا پیش کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے:۔ ترجمہ کی بحر وہی

رکھی گئی ہے جو اصل کی تھی یعنی،

"فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلات"

اس لئے کہ اس بحر میں سوز و گداز اور صوفیانہ اور فلسفیانہ خیالات ادا کرنے کی غیر معمولی صلاحیت ہے پھر مولائے روم[1] اس بحر کو غیر فانی بنا چکے ہیں۔ البتہ شروع کے چند اشعار جو اقبال نے کتاب پڑھنے والے سے مخاطب ہو کر لکھے ہیں۔ ان کے ترجمہ میں مثنوی کی بحر کی پابندی نہیں کی گئی ہے۔ اس لئے کہ یہ اشعار قطعہ بند ہیں اور خود اقبال نے ان کو مثنوی کی بحر سے الگ رکھا ہے۔

حتی الامکان میں نے کوشش کی ہے کہ ایک شعر کا مطلب ایک ہی شعر میں ادا ہو جائے لیکن دو ایک جگہ جب اردو، فارسی کے ایجاز و اختصار کا ساتھ نہ دے سکی تو اس اصول کی خلاف ورزی بھی کرنی پڑی ہے۔

فارسی محاوروں کا میں نے لفظی ترجمہ نہیں کیا۔ بلکہ اردو میں ان کے لئے قریب ترین انداز بیان اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔

کہیں کہیں اس خیال سے کہ کسی نازک مضمون کو ردوبدل میں ٹھیس نہ لگ جائے فارسی تراکیب کو ان کے حال پر قائم رکھا ہے۔

بعض موقعوں پر اقبال نے رومی عطار یا کسی اور شاعر کا شعر سلسلۂ بیان میں نقل کیا ہے اصل حوالہ کو قائم رکھنے کے لئے ایسے اشعار کا ترجمہ نہیں کیا گیا۔ فٹ نوٹ میں ان کے معنی دے دیئے ہیں۔

ایک آدھ جگہ مرکزی خیال کو قائم رکھتے ہوئے جزئیات کے بیان یا کسی تشبیہ و استعارہ کے ترجمہ میں کسی قدر آزادی سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن مجموعی طور پر میں نے پابند ترجمہ کی کوشش کی ہے اور اس بات کا خیال رکھا ہے کہ اقبال کے خیال کا ربط و تسلسل اور ان کے مطالب کا کوئی گوشہ ضائع نہ

[1] : مولانا جلال الدین رومیؒ کی مشہور فارسی مثنوی اسی بحر میں ہے۔

ہونے پائے۔

ایک اہم سوال اس منظوم ترجمہ کے نام کے انتخاب کا تھا۔ "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" کی ہر جستگی اس کے اردو ترجمہ میں کسی طرح نہ آسکتی تھی۔ اس لئے فارسی نام سے بے نیاز ہو کر کوئی نام سوچنا تھا اور وہ نام ایسا ہونا چاہیئے تھا جو اقبال کے طرز فکر سے ہم آہنگ ہو اور ان کی دوسری تصانیف کے ناموں سے کچھ مماثلت رکھتا ہو۔ آخر مثنوی ہی نے میری رہنمائی کی اور اس کے ابواب کے عنوانات میں سے ایک عنوان "حکمت کلیمی" اس مقصد کے لئے منتخب کیا گیا۔ اس نام میں اقبال کی تصانیف کے ناموں کا آہنگ بھی ہے اور نفس مضمون سے مناسبت بھی۔

آخر میں میں اپنی اس ادبی کوشش کو پبلک کے سامنے پیش کرتے ہوئے اتنا اور عرض کردوں گا کہ کسی ادبی شاہکار کے ترجمے میں اصل کی سی آب و تاب کا پیدا ہونا تو محالات سے ہے لیکن اگر میرے اس منظوم ترجمہ میں پڑھنے والوں کو اقبال کے لہجہ کی کچھ بھی جھلک اور ان کی تصانیف کے ماحول کا ہلکا سا پرتو بھی نظر آئے تو میں اپنی کوششوں کو مشکور سمجھوں گا اور اس کو اقبال ہی کے فیض روحانی پر محمول کروں گا۔

علی گڑھ۔ ۲۔ ذکاء اللہ روڈ
۲۸ مارچ ۱۹۵۴ء

ظفر احمد صدیقی

مقدمہ

مثنوی کی اہمیت

مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق"، شاعر مشرق علامہ اقبال مرحوم کی آخر عمر کی تصنیف ہے، جب ان کا پیغام مکمل ہو چکا تھا اور ان کا فلسفہ اپنی پختگی کی معراج حاصل کر چکا تھا۔ اپنے ابتدائی کلام میں اقبال راہ حق کے ایک ایسے متجسس زائر کی طرح نظر آتے ہیں جو عقل سلیم کی روشنی میں مشاہدات اور تجربات سے سبق لیتا ہوا منزل کی طرف بڑھ رہا ہے لیکن زیر نظر مثنوی میں ان کی حیثیت اس راہبر کی سی ہے جو راہ کے نشیب و فراز سے واقف ہو کر دوسروں کو اپنے تجربات سے مستفید کرنا چاہتا ہو۔

ابتدائی دور کے بعد یہ پہلی اور آخری طویل مسلسل نظم ہے جس کے ذریعے اقبال نے اپنے پیغام کو یکجا اور مربوط طریقے سے ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لحاظ سے۔ اگر اس کو ان کے پختہ خیالات و افکار کا نچوڑ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ کسی فلسفہ یا نظریہ کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ عملی زندگی کے ساتھ اس کی تطبیق ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ زیر نظر مثنوی کی ایک منفرد خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں اقبال

کے فلسفہ کے بنیادی اصول بھی ہیں اور ان کی اہم جزئیات بھی۔ اس میں ان کا نظریۂ سیاست بھی ہے اور اس کی عملی ہدایات بھی۔ ان کی فکر و نظر کی رفعتیں بھی ہیں اور ان کے عزم و یقین کی استواری بھی۔ ان کے تخیل کی گیرائی بھی ہے اور جذبات کی گہرائی بھی۔ عقل و اندیشہ کی تگ و تاز بھی ہے اور عشق و محبت کا سوز و ساز بھی۔

اس مثنوی میں شاعرِ مشرق اپنے پیغمبرانہ منصب کا حق ادا کرنے کے لئے مضطرب نظر آتا ہے۔ وہ اقوامِ مشرق کی زبوں حالی کو دیکھتا ہے اور اس کا حساس دل خون ہوتا ہے وہ مشرق کو مغرب کے استیلا سے آزاد دیکھنا چاہتا ہے اور اس کے لئے ایک راہ عمل تجویز کرتا ہے۔ مثنوی کا عنوان اسی راہِ عمل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

مشرق کی یہ پاسداری مغرب سے تعصب یا کسی محدود نسلی اور قومی جذبہ کا نتیجہ نہیں بلکہ ان کے فلسفۂ خودی کا براہ راست اقتضا ہے۔ اول تو وہ کسی انسان کو دوسرے انسان کا غلام دیکھنا نہیں چاہتے دوسرے وہ جن روحانی اور اخلاقی قدروں کے علمبردار ہیں۔ مشرق کا مزاج ان سے بنیادی طور پر ہم آہنگ ہے اس کے برخلاف مغرب کی لادینی سیاست اور مادیت ان کی نفی کرتی ہے۔ اسی فرعونی سیاست نے دنیا کو میدان جنگ بنا رکھا ہے اور انسانی اخوت اور حریت کا دامن پارہ پارہ کر دیا ہے۔ مشرق اپنے نصب العین سے غفلت اور عزم و یقین کی کمی کی وجہ سے مغرب کی چیرہ دستیوں کا شکار ہو رہا ہے۔ اقبال اس کو اس کا بھولا ہوا نصب العین یاد دلاتے ہیں اور ایک عزم کلیمانہ کے ساتھ اس نظام باطل کو توڑ کر ایک نئی انسانیت کی تعمیر کی ترغیب دیتے ہیں۔ ان کی ہمدردی صرف اقوامِ مشرق سے نہیں بلکہ وہ تمام انسانیت کے غم خوار ہیں وہ ساری دنیا سے تمیز بندہ و آقا اور زبردست کا زیردست پر ظلم و ستم مٹانا چاہتے ہیں۔ اس نصب العین کا حامل بننے کی صلاحیت وہ مغرب سے زیادہ مشرق میں پاتے ہیں۔ اس لئے مشرق کو خطاب کرتے ہیں۔

مثنوی کی زبان فارسی رکھنے میں بھی ان کی یہی مصلحت ہے کہ ان کا پیغام ایشیا کے زیادہ سے زیادہ گوشوں تک پہنچ سکے۔ مثنوی کی تصنیف کا زمانہ تقریباً وہی ہے۔ جب وہ نادر شاہ مرحوم کی دعوت پر سیاحت افغانستان کے بعد ہندوستان لوٹے تھے۔ اس سفر نے شاید ان کی امیدوں اور دلولوں کو تازہ کر دیا تھا اور وحدت ایشیا کے خواب کی تعبیر انھیں قریب نظر آنے لگی تھی۔ ان ہی دلولوں اور تمناؤں کا عکس مثنوی "پس چہ باید کرد" میں نظر آتا ہے۔

اس کے علاوہ ان کی دور رس نظریں عام طور سے ممالک ایشیا میں ایک انقلاب کو کروٹیں لیتا ہوا دیکھ رہی تھیں۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ مشرق خواب غفلت سے بیدار ہو رہا ہے اور مغربی اقتدار کی زنجیروں کو توڑ دینا چاہتا ہے۔ اس موقع کو وہ خاص طور سے اپنے پیغام کے لئے سازگار سمجھتے ہیں تاکہ اس تحریک انقلاب کو صحیح راستہ پر لگایا جا سکے۔

اس مثنوی کا مطالعہ اقبال کے سیاسی مسلک کے متعلق بہت سی غلط فہمیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ ان کے ابتدائی کلام کے بعض رجحانات کی بنا پر کچھ سطحی حضرات ان کو برطانیہ کا ہوا خواہ اور ہندوستان کی تحریک آزادی کا مخالف سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن مثنوی "پس چہ باید کرد" کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آزادی ہند کے کتنے مضطرب شیدائی اور برطانوی استعماریت کے کس قدر سخت دشمن ہیں۔ اقبال کی نظر مرض کی ظاہری علامتوں سے زیادہ اس کے اسباب پر پڑتی ہے وہ اس فلسفہ اور اس تہذیب کی بنیادوں پر ضرب کاری لگانا چاہتے ہیں۔ جس نے ہندوستان اور دوسرے ممالک ایشیا کو ایک صید زبوں کی طرح اپنے دام سیاست میں تڑپا رکھا ہے۔ مثنوی کے دسویں باب (ہندیوں کے افتراق پر چند آنسو) میں جس خلوص اور درد کے ساتھ وہ ہندوستانیوں کے باہمی افتراق کا ماتم کرتے ہیں۔ اس سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ان کا دامن تعصب، تنگ نظری اور فرقہ پرستی سے کس قدر پاک تھا۔

اقبال کے متعلق بعض لوگوں کو ایک غلط فہمی یہ بھی ہے کہ وہ مسلمانوں کے قومی شاعر تھے۔ وہ نازیوں اور فسطائیوں کی طرح اپنی قوم کو دنیا پر غالب اور حکمران دیکھنا چاہتے تھے۔ اس سے زیادہ دور از حقیقت الزام اقبال کے فلسفہ پر نہیں لگایا جا سکتا۔ مثنوی "پس چہ باید کرد"، اس الزام کو بھی اقبال کے دامن سے دھو دیتی ہے۔ زیر نظر مثنوی میں وہ کسی پان اسلامزم کے نظریہ یا اتحاد بین المسلمین کی تلقین نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ وحدتِ ایشیا کا علم بلند کر رہے ہیں۔ ان کا خطاب مسلمانوں سے نہیں۔ تمام اقوام ایشیا سے ہے۔

مثنوی کی زبان اور آرٹ

مثنوی کی زبان جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا فارسی ہے۔ فارسی زبان اقبال خاص طور سے اس وقت اختیار کرتے ہیں جب وہ مشرق کی ترجمانی یا مشرق کو مخاطب کرنا چاہتے ہیں مثلاً "پیام مشرق"، "زبور عجم" یا "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق"، میں۔ اس کے علاوہ خیالات کے مسلسل اور مربوط اظہار کے لیے بھی وہ کبھی کبھی فارسی کو اپنا ذریعہ بناتے ہیں۔ مثلاً مثنوی اسرار و رموز، یا جاوید نامہ، وغیرہ۔ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ اقبال کی جتنی طویل اور مربوط تصانیف ہیں۔ وہ سب فارسی میں ہیں، اردو میں کوئی نہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ فارسی اپنی وسعت اور روایات کی بنا پر کسی بسیط اور ہم آہنگ پیغام کا حامل بننے کی زیادہ صلاحیت رکھتی ہے۔ اقبال کے ایک قریب ترین ہم نشین کی روایت ہے کہ انھوں نے بال جبریل کے ساقی نامہ کو اپنے پیغام اور فلسفہ کی تشریح کے لئے استعمال کرنا چاہا تھا۔ لیکن اردو کی تنگ دامانی ان کے مقصد کا ساتھ نہ دے سکی۔

اقبال فارسی کا بہت اعلیٰ ذوق اور فارسی ادب پر بہت وسیع نظر رکھتے تھے۔ سید سلیمان ندوی مرحوم کے نام ان کے بعض مکتوبات سے پتہ چلتا ہے کہ صحت زبان کا ان کو خاص خیال رہتا تھا اور وہ فارسی کے مسلم الثبوت اساتذہ کی سندوں کے خلاف ایک قدم بھی اٹھانا نہیں

چاہتے تھے[1]۔ لیکن زبان کی حیثیت ان کے نزدیک ثانوی تھی، اور ظاہر ہے ایسے فلسفیانہ خیالات کے ادا کرنے میں ہونا بھی چاہئے تھی۔ وہ زبان کے پیمانوں یا محاوروں میں الجھ کر مضمون سے بے اعتنائی برتنے کے روادار نہ تھے۔ پھر بھی خیالات کی پختگی کے ساتھ ساتھ ہمیں ان کے یہاں زبان کا بھی تدریجی ارتقا ملتا ہے۔ اقبال کی فارسی تصانیف کو بہ اعتبار زبان تین دوروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

اوّل تو اسرار و رموز اور پیام مشرق کا دور ہے۔ ابھی اقبال کا آرٹ اپنی ابتدائی منزل میں ہے۔ وہ زبان کے محاسن، تشبیہوں، استعاروں، دلکش ترکیبوں اور مترنم بحروں کا سہارا لیتے ہیں۔ اکثر مختصر مفہوم کو اپنے شاعرانہ تخیل سے پھیلا کر بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ زبان بعض اوقات مفہوم کا ساتھ نہیں دے پاتی۔ تو وہ مافی الذہن کو مثالوں، حکایتوں اور تشبیہوں کے ذریعے سے واضح کرتے ہیں۔ یہاں شاعر اقبال فلسفی اقبال پر مقدم ہیں۔ اور شعریت ان کے تخیل پر غالب۔

اقبال کی فارسی شاعری کا دوسرا دور جاوید نامہ کا دور کہا جا سکتا ہے۔ یہاں اُن کا آرٹ اور فلسفہ ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔ تخیل کی بلندیوں کے ساتھ آرٹ کی رفعتیں بھی دوش بدوش نظر آتی ہیں زبان کی روانی، خیالات کی فراوانی کا ساتھ دیتی ہے۔ بعض اعتبارات سے یہ دور اقبال کے تخلیقی آرٹ کی معراج ہے۔ اس سے آگے کمال فن کا تصور مشکل ہی سے ذہن میں آتا ہے۔

مثنوی "پس چہ باید کرد" اقبال کی فارسی شاعری کے تیسرے اور آخری دور کی نمائندگی کرتی ہے۔ اب اقبال کی نظر آرٹ کے ظاہری لوازم پر نہیں۔ ان کا فلسفہ اور پیغام مکمل ہو چکا ہے وہ زبان کو صرف ایک آلۂ کار کی حیثیت سے استعمال کرتے ہیں، ایک ایسا آلہ جس پر ان کو بے انتہا قدرت حاصل ہے۔ اپنے مطلب کے اظہار میں اب ان کو پیرایۂ بیان ڈھونڈھنا نہیں پڑتا۔ بلکہ اُن کے خیالات جوئے کہسار کی طرح خود اپنے نکاس کا قریب ترین راستہ تلاش کر لیتے ہیں۔

---

[1] اقبال نامہ (حصہ اوّل) مرتبہ شیخ عطاء اللہ خطوط نمبر ۴۰ - ۴۱ - ۴۲ وغیرہ۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے آرٹ نے سہل ممتنع کی شکل اختیار کر لی ہے۔ مختصر سے مختصر الفاظ میں وہ وسیع سے وسیع مفہوم کو اس طرح ادا کر جاتے ہیں کہ اس کا کوئی گوشہ یا پہلو ضائع ہونے نہیں پاتا اور ان کے پُر خلوص جذبات کی بھرپور چوٹ پڑھنے والے پر پڑتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مثنوی "پس چہ باید کرد" کی زبان میں پیام مشرق کی سی رنگینی اور جاوید نامہ کی سی رعنائی نہیں لیکن قوت اظہار اور اثر و سادگی میں اقبال کی کوئی دوسری تصنیف مشکل ہی سے اس کے درجہ کو پہنچتی ہے۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز چیز یہ ہے کہ گہرے سے گہرے فلسفیانہ خیالات ادا کرنے کے باوجود ان کی زبان میں کہیں اشکال نہیں آنے پاتا اور نہ زبان کی دلکشی اور صحت میں فرق آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام فارسی شعراء کے دیوانوں کے مقابلے میں اقبال کا فارسی کلام سمجھنا زیادہ آسان ہے۔ اگر فارسی کا ایک مبتدی طالب علم بھی ان کا مطالعہ شروع کرے تو اس کو زبان کی وجہ سے کوئی خاص دشواری پیش نہ آئے گی۔ بات یہ ہے کہ ایک معمولی درجے کا شاعر اکثر تخیل کی کمی کو زبان کے پیچوں، رنگین ترکیبوں اور دلکش محاوروں سے پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک عظیم شاعر جو اپنا پیغام دوسروں تک پہنچانے کے لئے ایک پیغمبر کی طرح بے چین ہوتا ہے وہ بیان کی آرائشوں اور صنعتوں کی طرف کم توجہ ہوتا ہے۔ اس کے آرٹ کا سارا کمال یہ ہوتا ہے کہ اس کا پیغام بے کم و کاست ادا ہو جائے اور اس کے افکار و جذبات کی بھرپور چوٹ پڑھنے والے پر پڑ سکے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کی زبان بے رنگ اور محاسن سے عاری ہوتی ہے۔ بلکہ اس میں رہینِ مشاطگی خارجی اور مصنوعی آرائشوں کی بجائے ایک قدرتی تناسب اور موزونیت کا حسن پایا جاتا ہے۔ اس میں دلکشی ہوتی ہے۔ لیکن ایک قدرتی آبشار یا جوئے کہسار کی سی، انسانی صنعت کے شاہکاروں کی سی نہیں۔ مثنوی "پس چہ باید کرد" اسی قسم کے فطری آرٹ کا ایک پاکیزہ نمونہ ہے۔

اقبال کا فلسفہ اور پیغام

مثنوی کے اجزا کا باہمی ربط منطقی نہیں نفسیاتی ہے۔ خیالات جس ترتیب

سے اقبال کے ذہن میں آئے ہیں وہ ان کو بیان کرتے چلے گئے ہیں۔ بعض باتیں اپنی اہمیت کی وجہ سے بار بار دہرائی گئی ہیں۔ بعض دعوے اور نظرئے محض مجملاً سامنے آئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پڑھنے والا مثنوی کے اثر میں کھو تو جاتا ہے۔ لیکن اس کا کوئی مربوط اور ہم آہنگ نظریہ اپنے ذہن میں قائم کرنے سے اکثر قاصر رہتا ہے۔ ان صفحات میں میں نے کوشش کی ہے کہ مثنوی کے پیغام کو اس کی فلسفیانہ بنیادوں کے ساتھ اور اقبال کے عام فلسفہ سے اس کا تعلق دکھاتے ہوئے مسلسل اور مربوط شکل میں پیش کردوں اور ساتھ ہی ساتھ اس کی فلسفیانہ قدر و قیمت کا جائزہ بھی لیتا چلوں۔

اقبال کے فلسفہ کا نقطۂ آغاز انسانی فطرت ہے۔ وہ راز زندگی کی جستجو میں ادھر اُدھر بھٹکنے کی بجائے انسانی فطرت کو اپنی تحقیق کا مرکز بناتے ہیں اور اس کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہو کر گوہر مقصود کو پالیتے ہیں۔ غور کیجئے تو کسی نظریہ کی صداقت، کسی فلسفہ کی قدر و قیمت یا کسی نظام زندگی کے حسن و قبح کے جانچنے کی اگر کوئی کسوٹی انسان کے پاس ہے۔ تو وہ یہی انسانی فطرت ہے۔ اسی رہبر کی رہنمائی میں اقبال اپنا فلسفیانہ سفر شروع کرتے ہیں۔

اس جستجو میں پہلی ناقابل انکار حقیقت جو ان کے سامنے آتی ہے۔ وہ انسانی فطرت کا عملی پہلو ہے۔ انسان کے اندر ایک حرکت ایک عمل ایک تڑپ نظر آتی ہے۔ زندگی عبارت ہی حرکت و عمل سے ہے۔ یہ جوئے رواں جبتک چل رہی ہے زندہ ہے۔ رک جائے تو یہی اس کی فنا ہے۔

یہ عمل اور حرکت بے سمت بے اصول نہیں۔ ایک بہتر زندگی اور ایک خوب تر حالت کی جستجو ہے۔ یہ محض جذبۂ عمل نہیں۔ بلکہ آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کا جذبہ ہے۔

اس جذبۂ ارتقا پر غور کرنے سے ایک اور حقیقت سامنے آتی ہے۔ کوئی قوت ہے جو عمل کے پس پردہ کارفرما ہے۔ کوئی جوہر ہے جو اپنے اظہار کی راہیں ڈھونڈھ رہا ہے۔ کوئی ذات ہے جو

بدلتے ہوئے حالات میں قائم رہتی ہے اور عمل کی منتشر کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے۔ اسی ذات کو ہم انسانی اعمال کا فاعل سمجھتے ہیں۔ اسی کو تمام افعال کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ ایک شخص اپنے بچپن کا لکھا ہوا خط دیکھتا ہے اور کہہ اٹھتا ہے: "یہ میں نے لکھا ہے"، یہ "میں" نہ اس کے جسم کا نام ہے، نہ ذہنی کیفیات کا۔ اس لئے کہ اس کا موجودہ جسم اور موجودہ ذہنی کیفیات وہ نہیں جو خط لکھنے کے وقت تھیں زندگی کی طویل مدت نے ان میں وسیع تغیر کر دیا ہے۔ "میں" کا اشارہ اس ذات کی طرف ہے۔ جو بچپن سے لے کر بڑھاپے تک موجود رہی ہے۔ اور تمام ظاہری تبدیلیوں اور انقلابوں کے باوجود باقی اور پائندہ ہے۔ یہی پائندہ دباتی جوہر نفس انسانی یا خودی سے تعبیر ہے۔ اس کی وجہ سے زید، زید ہے اور احمد، احمد۔ یہی تمام تغیرات کا منبع اور تمام اعمال کا سرچشمہ ہے۔ اقبال کے الفاظ میں خودی کیا ہے ایک "وحدتِ وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ جس سے تمام انسانی تخیلات وجذبات وتمنیات مستنیر ہوتے ہیں"۔ ایک "پراسرار شے جو فطرتِ انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے"۔ ایک "جوہر جو اپنے عمل کی رو سے ظاہر اور اپنی حقیقت کی رو سے مضمر ہے۔ جو تمام مشاہدات کا خالق ہے۔ مگر جس کی لطافت مشاہدہ کی گرم نگاہوں کی تاب نہیں لا سکتی[1]"۔ یہی انسان کی 'خودی' یا 'انا' ہے۔ یہ 'انا'، یہ 'میں'، کا احساس انسانی فطرت کے اندر اس قدر شدید اور اس قدر یقینی ہے کہ کسی شبہ سے زائل نہیں ہوتا۔

اب خودی اور اس کے جذبۂ ارتقا تک ہماری رسائی ہو گئی۔ مگر اس جذبۂ بیتاب کی منزل کبھی نہیں آتی۔ انسان کسی ترقی سے مطمئن نہیں ہوتا۔ ہر بلندی کے بعد بلند تر درجے کا جویا رہتا ہے۔ ہر رفعت اگلی رفعتوں کا زینہ ثابت ہوتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر خودی کا جذبۂ ارتقا غیر محدود ترقی یا درجۂ کمال کی آرزو کا دوسرا نام ہے۔ یہی کمال کی آرزو ہے جو انسانی فطرت کو بے چین رکھتی ہے

---

[1] دیباچہ اسرار خودی۔

اور کسی منزل پہ قرار نہیں لینے دیتی۔ اسی آرزوئے کمال کو اقبال جذبۂ عشق سے تعبیر کرتے ہیں۔ درجہ کمال یا ہستی کامل کا عشق۔ اسی سے وہ ہستی کامل کے وجود کا عرفان و یقین حاصل کرتے ہیں۔ غرض انسانی فطرت میں غوطہ زن ہو کر خودی کے جذبۂ عشق میں ڈوب کر ان کو وہ وجدان، وہ نظر، وہ یقین حاصل ہو جاتا ہے جس میں شک کی گنجائش نہیں رہتی۔

اقبال کے فلسفہ میں عشق ایک بے شعور جذبہ نہیں بلکہ ایک وجدان اور نظر کی حیثیت رکھتا ہے۔ عشق سے ہمیں خودی کی فطرت میں ایک دریچہ کھلا نظر آتا ہے۔ جس سے ہم ہستی کامل کے انوار اور جلوؤں کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو اس کے حضور میں پاتے ہیں۔ مثال کے طور پہ یوں کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح بو سونگھ کر ہم ایک پھول کی موجودگی کا احساس کرتے ہیں۔ جس طرح حسن کا تاثر ہمیں حسن کی موجودگی کا پتہ دیتا ہے۔ جس طرح روشنی کی کشش پروانہ کو بتا دیتی ہے کہ روشنی کدھر ہے اسی طرح عشق ایک صلاحیت ہے، ایک کشش ہے، ایک وجدان ہے، جس کے ذریعے سے براہ راست ہمیں ہستی کامل کے وجود کا یقین اور ایمان حاصل ہوتا ہے۔ عشق ایک قسم کا براہ راست مشاہدہ ہے جو سائنس کے ذریعۂ علم سے مختلف تو ہے۔ مگر کم یقینی نہیں۔ یہ اسی قسم کا یقین ہے۔ جیسا ہمیں اپنی ذات کا ہوتا ہے۔ جس کو سائنس کے ذریعۂ علم سے نہ ثابت کیا جا سکتا ہے۔ نہ اس کے خلاف ثبوت دیا جا سکتا ہے۔ پھر بھی ہمیں یقین ہوتا ہے کہ 'ہم' ہیں۔

اس طرح ہر انسان اپنی فطرت ہی میں ہستی کامل کے وجود کا یقین حاصل کر سکتا ہے بشرطیکہ اس کی فطرت صالح اور پاکیزہ ہو۔ خیر و شر کے امتیازات مسخ نہ ہو گئے ہوں اور حقیقی کمال و ارتقا کی آرزو مر دنہ پڑ گئی ہو۔

اب اقبال ایک اور پہلو سے ہستی کامل کے تصور پر روشنی ڈالتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ زندگی کی نشوونما اور کمال انسانی کے حصول کے لئے یہ عقیدہ کس قدر ضروری ہے۔

فطرت سلیم ہمیں بتاتی ہے کہ انسانی کمال خودغرضانہ مقاصد میں نہیں۔ بلکہ تمام انسانوں کی فلاح وبہبود کی کوششوں میں مضمر ہے۔ تمام انسانیت کی فلاح کا یہ نصب العین مادّی نقطہ نظر سے ہم آہنگ نہیں۔ حقیقت میں مادی نقطۂ نظر ہی انسانوں کی تقسیم اور تفریق کا باعث ہوتا ہے۔ مادّی منفعتوں کی فطرت ہی یہ ہے کہ ایک کی کامرانی دوسرے کی ناکامیابی کا باعث ہوتی ہے۔ ایک کی تسکین دوسرے کی محرومی ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خودغرضیاں آپس میں ٹکراتی ہیں۔ رقابتوں کا بازار گرم ہوتا ہے اور دنیا جہنم زار بن جاتی ہے۔ یہ ہے لادینیت اور مادیت کا لازمی ثمرہ۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان خدا کو نہ مان کر زندگی کے صحیح نصب العین تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔ اول تو یہ بات ہی مشتبہ رہتی ہے کہ زندگی کا کوئی مقصد ہے بھی یا نہیں۔ اگر کسی مقصد تک نگاہ کی رسائی بھی ہوئی تو وہ بہت پست اور محدود رہتا ہے۔ علاوہ ازیں مادیت میں انسان کے لئے یقین کی کوئی بنیاد نہیں ہوتی۔ شبہات بار بار اس کو الجھن میں ڈالتے ہیں کہ کہیں یہ میرے من مانے اعتبارات تو نہیں؟ کیا معلوم جس کو میں خوب سمجھ رہا ہوں وہ ناخوب ہو۔ جس کو میں ترقی کہتا ہوں، وہ تنزّل ہو؟ بالفرض اگر میں اپنی فطرت کے بتائے ہوئے مقصد کا اعتبار بھی کرلوں تو اس کا کیا یقین کہ یہ قابل حصول بھی ہے یا نہیں؟ مادی عالم اس کو سرسبز بھی ہونے دے گا یا میری کوشش وتدبیر کا گلا گھونٹ دے گا؟ ممکن ہے کوئی شوخ و شریر ہستی میرے جذبات اور ارادوں سے کھیل رہی ہو۔ اور مجھے ناقابل حصول مقاصد کے پیچھے ڈال کر میری ناکامی کا تماشا دیکھنا چاہتی ہو؟ مختصر یہ ہے کہ مادیت ہمیں زندگی کا کوئی اعلیٰ نصب العین اور اس نصب العین کا یقین نہیں دے سکتی۔ یہ نصب العین، اس پر کامل یقین، اس کے حصول کا والہانہ جذبہ، اس کی راہ میں سب کچھ قربان کردینے کی تڑپ اور اس کی کامیابی کا غیر متزلزل یقین خودی کی روحانی منزل مقصود یعنی ہستی کامل کے اقرار ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ خدا پر ایمان لانے سے ہمیں اپنی فطرت کے امتیازوں اور معیاروں پر اعتبار آجاتا ہے۔ ہمیں یقین ہوجاتا ہے کہ اس ساز

کے پردوں میں اسی ہستی کامل کی نوائیں ہیں۔ ہمیں اپنے مقصد کی قدر و قیمت اور اس کے قابل حصول ہونے پر یقین آجاتا ہے۔ ہمیں یقین ہوتا ہے کہ کائنات بھی ہمارے مقصد سے ہم آہنگ ہے اور اس کی یہ مجال نہیں کہ ہمیں اس کے حصول سے باز رکھ سکے۔ ارتقا کا صحیح مفہوم ہماری سمجھ میں آجاتا ہے اور اتقا کی منزل متعین ہوجاتی ہے۔ ارتقا وہی ہے جو ہستی کامل سے ہمیں نزدیک کرے۔ ارتقا کا صحیح راستہ وہی ہے جو اس کی رضا سے ہم آہنگ ہو۔ ہستی کامل کو اپنا معبود اور مقصود مان کر انسان مادّہ کی غلامی سے آزاد ہوجاتا ہے اور اخلاق الٰہیہ کا نمونہ بن کر انسانیت کے لئے پیام رحمت بن جاتا ہے۔ یہ ہے زندگی اور انسانیت کی تعمیر و ترقی کے لئے خدا کے عقیدہ کی اہمیت۔

یہ صحیح ہے کہ صالح انسانی فطرت ہمیں خدا کے وجود کا براہ راست یقین بخش سکتی ہے لیکن اکثر ہم فطرت کی گہرائیوں پر غور نہیں کرتے یا تعصبات اور فطرت کے زنگ ہماری نگاہوں کے لئے پردہ بن جاتے ہیں اور ہمیں معرفت نفس اور معرفت الٰہی تک پہنچنے میں مانع ہوتے ہیں۔ ایسے میں ایک مرد کامل اٹھتا ہے۔ جس کی فطرت پاکیزہ جس کا دل ماحول کی برائیوں سے پاک اور جس کا ذہن تعصبات سے خالی ہوتا ہے۔ اس کے دل پر حق کے جلوے بے نقاب ہوتے ہیں اور اس کی فطرت پر زندگی کے راز منکشف۔ اس کو خدا کے وجود کا براہ راست یقین حاصل ہوتا ہے۔ وہ ہمارے سامنے زندگی کا صحیح نصب العین رکھتا ہے اور اس پر چل کر بھی دکھاتا ہے۔ اس کے کردار کی عظمت اس کے پیغام کی انسان دوستی اور اس میں زندگی کا وسیع ترین مفاد منکروں کو بھی ایمان لانے پر مجبور کردیتا ہے۔ وہ جب اپنے براہ راست مشاہدہ یا "نظر" کی بنا پر ہمیں خدا کے وجود کی خبر دیتا ہے تو ہم اس کی صداقت امانت اور بے لوثی پر یقین رکھنے کی وجہ سے خدا کے وجود پر بھی یقین لے آتے ہیں۔

یہ مردِ کامل یا ہادیِ برحق اقبال کی نظر میں محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذات ہے۔ آپ کی ذات کمال انسانیت کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ اس لئے آپ کی محبت درجہ کمال کی محبت یا ہستی کامل کی محبت (عشق الٰہی) کی مترادف ہے۔

اس بحث سے یہ حقیقت واضح ہوگئی ہوگی کہ اقبال کے پیغام میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کسی مذہبی تعصب یا جانب داری کی وجہ سے نہیں بلکہ یہ ان کے فلسفہ کا لازمی جُز ہے۔ کمال انسانیت کی تلاش میں ان کی نظریں اِدھر اُدھر بھٹکتی ہیں اور آخر محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلّم پر آکر ٹھہر جاتی ہیں۔ وہ تعمیرِ انسانیت کے مختلف نظریوں اور فلسفوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے پیغام اور تعلیمات ہی میں ان کو دردِ انسانیت کی مکمل چارہ سازی نظر آتی ہے۔

اب اس بحث کو مختصر کرکے ہم پھر اقبال کے فلسفہ کے مرکزی نقطے پر آجاتے ہیں یعنی خودی خودی زندگی کا جوہر ہے اور خودی کا جوہر ہے عشق۔ عشق خودی کی فطرت کا ایک لازمی خاصہ ہے۔ عشق کا مفہوم اقبال کے یہاں بہت وسیع ہے۔ اس میں عمل کی تڑپ، جذبۂ ارتقا، درجۂ کمال کی آرزو، ہستی کامل کی کشش اور نمونۂ کمال یعنی محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سب شامل ہیں۔ عشق ہی ہمیں اپنی خودی کا یقین اور ہستی کامل پر ایمان عطا کرتا ہے۔ عشق ہی وہ راستہ دکھاتا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ عشق خود ہی وہ راستہ ہے۔ جس پر چل کر خودی کی تکمیل ہوتی ہے۔ عشق ہی اس راستے پر چلنے کا جذبہ دیتا ہے۔

جنون، فقر، لا الٰہ الا اللہ اسی عشق کے مختلف پہلو ہیں۔ جنوں سے مراد ہے مقصود کا والہانہ عشق جس میں دوسری مصلحتوں کو دخل نہ ہو۔ فقر سے مراد ہے ان چیزوں کی محبت اور پروا سے خالی ہونا جو مقصد کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ مثلاً مال و دولت دنیا سے وابستگی، موت کا ڈر، غیر اللہ سے خوف محبت یا لالچ وغیرہ۔ فقر عشق ہی کا منفی پہلو ہے۔ عشق میں مقصود سے

وابستگی کا اشارہ ہے اور فقر میں غیر مقصود سے بے نیازی کا۔ حقیقت میں دونوں لازم و ملزوم ہیں نہ عشق بغیر فقر کے مکمل ہے نہ فقر بغیر عشق کے معتبر۔ لا الٰہ الا اللہ میں ان ہی دونوں پہلوؤں کا عملی اظہار ہے۔ لا الٰہ میں تمام جھوٹے مقصدوں اور معبودوں کی نفی ہے۔ اور الا اللہ میں ایک معبود حقیقی (ہستی کامل) کا اقرار۔ یہ محض ایک نظریہ یا عقیدہ کا اعتراف نہیں۔ اس کا مفہوم محض یہ نہیں کہ ہم اللہ کے سوا کسی کو سجدہ نہ کریں گے اور معبود نہ سمجھیں گے۔ یہ اعلان ہے انسان کے نصب العین حیات کا اور اس پر نڈر ہو کر چلنے کا۔ یہ اعلان ہے انسانی حریت کا اور اعلان جنگ ہے۔ ان تمام قوتوں کے خلاف جو انسان کو اپنا محکوم اور غلام رکھنا چاہتی ہیں۔ ممکن ہے کوئی کہے کہ مکمل حریت تو لا الٰہ الا اللہ میں بھی حاصل نہیں۔ انسان کو کسی نہ کسی ہستی کے آگے جھکنا ہی پڑا، وہ بت نہ سہی خدا ہی سہی۔

اقبال اس کا جواب یہ دیں گے کہ خدا ہمارے تصور کمال کا قائم مقام ہے۔ خدا کا مقصود ہونا دراصل درجۂ کمال کا مقصود ہونا ہے۔ خدا کے آگے جھکنے میں خودی کی عظمت کم نہیں ہوتی بلکہ اس پر بے پایاں عظمتوں کے دروازے کھلتے ہیں۔ ساری کائنات اس کے قدموں میں ہوتی ہے۔ بڑی سے بڑی جابر قوت کے سامنے اس کا سر بلند رہتا ہے۔ اس کے برخلاف خدا کا انکار کر کے انسان مادیت کا محکوم و مغلوب ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی نفسانی خواہشوں کا غلام ہو کر دوسرے انسانوں کی حریت کا منکر ہو جاتا ہے۔ اس کو ہر قوت اور ہر طاقت سے ڈرنا پڑتا ہے گویا ایک خدا کو چھوڑ کر ہزاروں خداوندوں کے آگے سربسجود ہونا پڑتا ہے۔

اقبال کے فلسفہ میں عشق کی بحث نامکمل رہے گی اگر عقل کے ساتھ اس کا تعلق واضح نہ کیا جائے۔ عشق و محبت، درد و گداز، سوز و ساز، تب و تاب آرزو اور اسی قسم کے الفاظ کی کثرت سے بعض لوگ اقبال کے پیغام کی فلسفیانہ قدر و قیمت کے متعلق رائے قائم کرنے میں غلطی کر جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ایک مسلمان کے جذبات عقیدت ہیں جو عقل و خرد کی محفل

میں درخور اعتنا نہیں۔ علم و عقل کی تنقید اور عشق و جنوں کی مدح سرائی اور بھی اس خیال کی تائید کرتی ہے۔ مگر یہ خیال محض سطحی ہے۔ اقبال عقل کے منکر نہیں۔ عقل وہ قوت ہے جو مشاہدات تجربات اور معلومات سے نئے نتائج اور قوانین اخذ کرنے میں ہماری مدد کرتی ہے۔ مادّی اشیاء اور محسوسات کے ربط کو سمجھنے اور ان کے خواص کو معلوم کرنے میں عقل سے مدد لینا ناگزیر ہے۔

عقل کے بغیر اس عالم اسباب میں ہم ایک قدم بھی نہیں چل سکتے۔ تجربہ اور عقل کے ذریعہ سے ہمیں جو علم حاصل ہوتا ہے (جس پر کہ سائنس کی بنیاد ہے) وہ بھی اپنی جگہ زندگی کے لئے ضروری ہے۔ مختصر یہ ہے جہاں تک اس عقل و علم کی رسائی ہے۔ وہاں تک اقبال ان کی قدر و قیمت سے انکار نہیں کرتے۔ لیکن کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں۔ جو اس عقل اور اس سائنسی علم کی دسترس سے باہر ہیں۔ مثلاً زندگی کا مقصد اصلی، کائنات کی علت غائی، خودی کی حقیقت خدا کا وجود۔ یہ چیزیں اس محدود عقل سے ثابت نہیں ہوتیں۔ عقل محض ان بنیادی سوالوں کے متعلق ایک شک اور ایک تذبذب سے آگے نہیں بڑھتی۔ ممکن ہے خدا ہو، ممکن ہے خدا نہ ہو۔ خود اپنی ذات کے متعلق بھی عقل ہمیں یقینی علم نہیں دیتی وہ اس شک میں رہتی ہے کہ ممکن ہے یہ احساس خودی محض ایک فریب نظر ہو۔ حد یہ ہے کہ ان چیزوں میں بھی جن سے عقل پوری طرح متعارف اور مانوس ہے ایک فلسفیانہ شک کی گنجائش باقی رہتی ہے۔ علت و اسباب کے قانون اور اشیاء کے خواص کے متعلق عقل ہمیں ایک ظن غالب ضرور دے دیتی ہے۔ لیکن ایسا یقین نہیں دیتی جس میں شک و شبہ کا امکان نہ ہو۔ لیکن زندگی شک و شبہ کے سہارے بسر نہیں کی جا سکتی زندگی کی فطرت عملی ہے اور عمل کے لئے یقین لازمی۔ یہ یقین کہ میں ہوں یہ امتیازات جو مجھے نظر آ رہے ہیں اصلیت رکھتے ہیں۔ یہ مقاصد جن کے لئے میں عمل کر رہا ہوں

واقعی حاصل کئے جانے کے قابل ہیں۔

خوش قسمتی سے خودی کی عملی فطرت میں ہی اس یقین کی بنیاد بھی ہے۔ خودی کا جذبہ عشق راہ ارتقا بھی بتاتا ہے اور اس پر ایمان بھی عطا کرتا ہے۔ اس لئے اقبال یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ یقین صرف عشق ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ عقل کے دامن میں شک و تذبذب اور تخمین و ظن کے سوا کچھ نہیں۔ اقبال کا یہ کہنا عقل کے درجے سے چشم پوشی کی بنا پر نہیں بلکہ عقل کی حقیقت اور حدود پر گہرے غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ لیکن جس عقل پر وہ چشمک زنی کرتے ہیں وہ محدود عقل ہے جو اپنی حدود اور حقیقت کو نہ سمجھ کر زندگی کے اعلیٰ مقاصد کی نفی کرتی ہے۔ جو سائنسی علم کو تمام علم کا معیار مان کر عشق کے حقائق کا انکار کر بیٹھتی ہے۔ جو عشق سے باغی اور مادی عالم میں محصور ہوتی ہے۔ لیکن درحقیقت عشق اور عقل میں کوئی تضاد نہیں۔ بات صرف یہ ہے کہ عشق جن انوار کا مشاہدہ کرتا ہے عقل ان کو نہیں دیکھتی۔ اس لئے بعض اوقات اپنے تعصب اور تنگ نظری میں ان سے انکار کر جاتی ہے۔ لیکن عقل سلیم جو اپنی حدود کو سمجھتی ہے اور اپنی حقیقت کو پہچانتی ہے وہ اس عالم کے عجائبات سے انکار کی جرأت نہیں کر سکتی جس میں اس کو رسائی حاصل نہیں بلکہ منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے چراغِ راہ کا کام دیتی ہے۔ وہ ہمارے اندر ایک خلش ایک تجسس پیدا کر کے رازِ حقیقت کی جستجو پر مائل کرتی ہے۔ اپنی حد تک ہمیں مائل بہ جستجو کر کے عشق کے لئے جگہ چھوڑ دیتی ہے۔ اب آگے عشق ہماری رہ نمائی کرتا ہے اور بارگاہ حقیقت میں باریاب کرتا ہے۔ اپنی خودی کا، خدا کا، اور اپنے نصب العین کا یقین عطا کرتا ہے۔ اب عقل جو عشق سے مفاہمت کر چکی ہے اس نصب العین کے حصول میں عشق کی مدد کرتی ہے۔ اس عالم علت و اسباب کو سمجھنے اور اس کو مسخر کرنے میں عقل سے کام لینا عشق کے لئے ناگزیر بھی ہے۔ غرض، وہ عقل جو تابع عشق یا ادب خوردۂ دل ہو اسے اقبال

خودی کی تکمیل کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔

اس گفتگو سے یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ اقبال کا سارا پیغام ایک نقطۂ عشق کی تفسیر ہے عشق کیا ہے خودی کی فطرت کا ایک لازمی عنصر۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خودی اور عشق کے متعلق چند اور ضروری امور واضح کر دیئے جائیں جن کی طرف اقبال ہماری توجہ مبذول کراتے ہیں۔

جیسا پہلے کہا جا چکا ہے خودی ہماری ذات کی وہ مرکزی قوت یا شعور کا وہ روشن نقطہ ہے جسے ہم اپنی 'انا' یا 'میں' سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ 'انا' یا 'میں'، خودی کی انفرادیت کی دلیل ہے۔

خودی ایک غیر مادّی جوہر ہے جو مادّہ سے ہر دم برسرِ پیکار ہے۔ وہ مادّی عالم کو مغلوب کر کے اپنی نشو و نما حاصل کرنے کے لئے بے چین ہے۔ اس نشو و نما کی سمت بھی غیر مادّی ہے یعنی ہستی کامل کی جانب اور اس کے عشق کے ذریعے سے۔

خودی کی انفرادیت یا اس کے جذبۂ عشق سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اس کی تکمیل سب سے الگ تھلگ اس کی ذات ہی میں ممکن ہے۔ خودی کا جذبۂ عشق ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اس کی فطرت میں کچھ بے خودی، بھی ہے۔ خودی اپنے تعلقات اور سوسائٹی کے پس منظر ہی میں پہنچانی جا سکتی ہے۔ جس طرح موج کا وجود دریا کے ساتھ وابستہ ہے، دریا سے الگ ہو کر کچھ نہیں، اسی طرح فرد ربط ملت سے قائم ہے۔ ملت سے الگ کر کے دیکھئے تو فرد وہ فرد نہ رہے گا۔ اسی طرح فرد کی تکمیل بھی سوسائٹی سے الگ اور اس کو نظر انداز کر کے ممکن نہیں۔ فرد کی تسکین اور تکمیل کے لئے اس کی اجتماعی فطرت کے تقاضوں کا پورا ہونا بھی ضروری ہے۔

خودی اپنے جذبۂ عشق کی وجہ سے غیر فانی بھی ہے۔ لافانی اس مفہوم میں نہیں کہ وہ بے شمار مدت تک زمانہ کے دریا میں بہتی چلی جائے گی۔ یا اس کی زندگی کی سانسوں میں

اضافہ ہوتا چلا جائے گا بلکہ اس لحاظ سے کہ اس کا جوہر زمان و مکاں سے بالاتر ہے۔ وہ زمانہ سے تعلق رکھتے ہوئے بھی زمانہ میں محدود نہیں۔ اس کا جذبۂ عشق اسے مادیت سے بے نیاز اور قید زماں و مکان سے آزاد کرتا ہے۔ اگر وہ اپنی اس حیثیت کا ادراک کرے۔ اور اللہ کے ساتھ اپنے تعلق کو سمجھ لے تو وہی لمحہ اس کی لافانیت کا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ خودی اور خدا کا حقیقی تعلق کیا ہے۔ اس پر بھی عشق ہی روشنی ڈال سکتا ہے۔ اقبال کے نزدیک یہ تعلق بہت گہرا بہت قریبی اور تقریباً عینیت کا ہے۔ یوں سمجھئے کہ خدا وہ سرچشمۂ وجود یا ہمہ گیر خودی ہے۔ جس سے ہر خودی کی اصل ہے۔ خودی اپنی اصل کے لحاظ سے ذات خداوندی سے مختلف نہیں لیکن اب اپنی انفرادیت کے لحاظ سے ایک علیحدہ شخصیت کی مالک ہے۔ اس کے تجربات اس کے مشاہدات اس کے اعمال اور افعال اس کے اپنے ہیں۔ ان میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔

اسی طرح خدا کی ذات میں اقبال ایک تشخص اور انفرادیت کے قائل ہیں۔ خدا سرچشمۂ وجود ہوتے ہوئے بھی موجودات کی ایک مجرد خصوصیت یا افراد میں ایک بے جان مشترک تصور (جیسے انسانوں میں انسانیت) نہیں بلکہ زندہ و پائندہ ایک مستقل اور منفرد وجود ہے۔ اس کی انفرادیت سب سے حقیقی، سب سے نرالی سب سے انوکھی، بے چگوں و بے نظیر انفرادیت ہے۔ اسی طرح خودی سرچشمۂ وجود یا ذات خداوندی سے ماخوذ ہونے کے باوجود ایک الگ انفرادیت کی مالک ہے۔

خدا اور خودی کے تعلق کے بارے میں اقبال کے خیالات کچھ ایسے پیچیدہ ہیں کہ سطحی مطالعہ میں ان کی غلط تفسیر کیجا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض شارحین نے ان کو عقیدۂ وحدت الوجود کا مخالف سمجھا ہے اور بعض نے موافق۔ بعض کی نظر میں وہ تصوف کے علم بردار ہیں اور بعض کے

نزدیک اس سے بیزار۔

حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک خودی کی اصل و بنیاد کا تعلق ہے وہ وحدت الوجود کی طرف جھکتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن جہاں خودی کی انفرادیت اور مقصد زندگی کا تعلق ہے وہ ان صوفیوں کے سخت ناقد ہیں جنھوں نے بدھ مت، فلسفہ ویدانت یا نو فلاطونیت کے زیر اثر اپنے تصوف کی تشکیل کی ہے۔ وہ منصور حلاج کے مشہور قول "انا الحق" کے یہ معنی نہیں لیتے کہ میں خدا ہوں بلکہ وہ اس کی یوں تعبیر کرتے ہیں کہ میری خودی ایک دھوکہ یا فریب نظر نہیں بلکہ حقیقت رکھتی ہے۔

عام صوفی وحدت الوجود کا یہ منشا سمجھتے ہیں کہ خودی اس کی انفرادیت اور تعینات عالم کو محض فریب نظر ہی سمجھا جائے اور اس فریب کو مٹانے کی کوشش کی جائے۔ ان کے نزدیک عشق کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنی "انا" یا انفرادیت کو ہستیٔ خداوندی میں جذب کردے۔ قطرہ سمندر میں اپنے وجود کو کھودے اور سمندر بن جائے۔

اقبال اس عقیدہ کی سختی سے تردید کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک "انا" یا انفرادیت ایک نعمت ہے جس کو وہ کسی صورت میں کھونے کے لئے تیار نہیں۔ ایک درویش کے استفسار پر کہ آیا وہ وصل خداوندی کے خواہاں ہیں۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ اگر مجھے معلوم ہو کہ خدا میری طرف آرہا ہے تو میں اس سے اتنا دور بھاگنے کی کوشش کروں گا جتنا ممکن ہے

اقبال کے نزدیک خواہش وجود، خواہش اظہار، اور ذوق حفظ زندگی ہر چیز کی فطرت میں مضمر ہے۔ خودی کے جذبۂ عشق کا تقاضا بھی یہی ہے کہ وہ ممکن کمالات سے اپنے آپ کو آراستہ کرکے اپنی انفرادیت کو زیادہ مکمل اور زیادہ حقیقی بنائے۔ وہ اس کو عشق کی کم ظرفی سمجھتے ہیں کہ انسان جلوۂ حق کے سامنے اپنے ہوش اور اپنی انفرادیت کو گم کردے۔ معراج مصطفیٰ سے

اقبال یہ سبق حاصل کرتے ہیں کہ انتہائے قرب کے باوجود اپنی انفرادیت کو صحیح و سالم لیکر اس عالم آب و گل کی طرف لوٹنے اور اس کی کشاکشوں میں حصہ لینے ہی میں خودی کی معراج ہے۔[1]

اس کے علاوہ غور کیجئے تو اس دعوے میں کھلا ہوا تضاد ہے کہ خودی کو فنا کر دینے میں خودی کا فائدہ یا کمال مضمر ہے۔ خودی باقی ہی کہاں رہی جو اس کمال یا فائدے سے فائدہ اٹھائے۔

نیز فنائے خودی کے عقیدہ میں اس سوال کا کوئی تشفی بخش جواب نہیں کہ اگر خودی ایسی رہی نامحمود چیز تھی تو آخر اس دھوکہ کی ضرورت کیا تھی۔ یہ فریب خودی اور فریب کائنات کیا صرف اس لئے ہے کہ ہم اس میں مبتلا ہو کر اس سے نکلنے کی کوشش کریں اور اگر یہ محض فریب ہے تو اس کا قائم رہنا یا نہ رہنا دونوں یکساں ہیں

آخری اور بہت اہم دلیل اس عقیدے کے خلاف یہ ہے کہ اس کو مان کر زندگی اور انسانیت کی اعلیٰ قدریں ختم ہو جاتی ہیں۔ خیر کی حمایت اور شر کے خلاف جدوجہد کا جذبہ سرد پڑ جاتا ہے۔ جب سب کچھ دھوکہ ہے تو ہمارے ہاتھ ہلانے یا کوشش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

اس کے برخلاف اقبال خودی کے جذبۂ عشق کا تقاضا یہ سمجھتے ہیں کہ انسان رضائے الٰہی پر چل کر اپنی خودی کو زیادہ مکمل اور زیادہ حقیقی بنائے۔ اپنی انفرادیت اور اپنے وجود کو نہیں بلکہ اپنی مرضی اور خواہشات کو رضائے الٰہی میں فنا کر کے اپنے آپ کو اخلاقِ الٰہیہ کا نمونہ بنائے۔ اس مادی عالم میں رہتے ہوئے اس کو اپنا مقصود نہ بنائے بلکہ اپنی اصل اور اللہ سے اپنے تعلق کو یاد رکھے اور اس کے تقاضوں پر عمل کرے۔ یہی حضوری اور تعلق مع اللہ کا مفہوم ہے۔

---

[1] اسلام میں مذہبی فکر کی نئی تشکیل (بزبان انگریزی) از اقبال صفحہ ۱۴۴

تصوف، طریقت اور شریعت کے بارے میں اقبال نے اپنے ایک خط میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے یہ خط ان کے فلسفہ کی بہت سی پیچیدگیوں کو حل کر دیتا ہے۔ اس لئے اس کا ایک ضروری اقتباس یہاں درج کیا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں :۔

"دین اسلام ..... نفس انسانی اور اس کی مرکزی قوتوں کو فنا نہیں کرتا بلکہ ان کے عمل کے لئے حدود معین کرتا ہے ان حدود کے معین کرنے کا نام اصطلاح اسلام میں شریعت یا قانون الٰہی ہے ..... بہرحال حدود خودی کے تعین کا نام شریعت ہے اور شریعت کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرنے کا نام طریقت ہے۔ جب احکام الٰہی خودی میں اس حد تک سرایت کر جائیں کہ خودی کے پرائیوٹ امیال و عواطف باقی نہ رہیں اور صرف رضائے الٰہی اس کا مقصود ہو جائے تو زندگی کی اس کیفیت کو بعض اکابر صوفیائے اسلام نے فنا کہا ہے۔ بعض نے اسی کا نام بقا رکھا ہے۔ لیکن ہندی اور ایرانی صوفیہ میں سے اکثر نے مسئلہ فنا کی تفسیر فلسفہ ویدانت اور بدھ مت کے زیر اثر کی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اس وقت عملی اعتبار سے ناکارہ محض ہے۔ میرے عقیدے کی رو سے یہ تفسیر بغداد کی تباہی سے بھی زیادہ خطرناک تھی۔ اور ایک معنی میں میری تمام تحریریں اسی تفسیر کے

خلاف ایک قسم کی بغاوت ہیں۔"[1]

خودی اور کائنات کے تعلق کے بارے میں بھی اقبال کا نقطۂ نظر عام صوفیوں سے مختلف ہے۔ کائنات کی اصل خدا ہی ہے۔ زماں و مکاں کی بھی اصل خدا ہی ہے۔ لیکن وہ اس کے قائل نہیں کہ کائنات کو غیر حقیقی یا فریب نظر مان کر اس سے فرار اختیار کیا جائے۔ مانا کہ کائنات کا وجود خدا سے ماخوذ ہے۔ لیکن ان امتیازات اور تعینات کو خودی کی فطرت میں ودیعت کرنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ خودی ان کو حقیقی مان کر اپنی عملی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لئے کام میں لائے۔ جہاں تک مادّی عالم کے مقصود بنانے کا تعلق ہے۔ اقبال اس کی نفی کرتے ہیں۔ لیکن جہاں اس کو خودی کے میدانِ عمل یا عشق کی آزمائش گاہ کے طور پر استعمال کئے جانے کا سوال ہے۔ وہاں اقبال ان امتیازات کو قبول کرتے ہیں۔

ایک لحاظ سے اقبال مادّی عالم کو ایک ایسا بت خانہ سمجھتے ہیں جس کو خودی نے تراشا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ عالم غیر حقیقی ہے یا خودی کی مرضی پر ہے اس کو مانے یا نہ مانے۔ منشا یہ ہے کہ خودی اپنی عملی فطرت کی بنا پر مجبور ہے کہ عالم کے امتیازات اور تعینات کو تسلیم کرے۔ وہ مجبور ہے کہ اس بت خانۂ شش جہات کو دیکھے اور حقیقی سمجھے اقبال اس کو بت خانہ اس لئے نہیں کہتے کہ اس کی حقیقت سے انکار کرنا چاہتے ہیں۔ چونکہ یہ عالم خودی کی نظر کو اس کے مقصد سے ہٹا کر اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اس لئے اس کو بتخانہ کہا گیا۔ اس بت خانے کا توڑنا یہی ہے کہ اس کو مقصود و معبود نہ بنایا جائے بلکہ اس کو مسخر کر کے رضائے الٰہی کی راہ میں استعمال کیا جائے۔ غرض اقبال کا عشق ہمہ عمل اور

---

[1] یہ خط علامہ اقبال نے میری ایک نظم کے جواب میں دسمبر ۱۹۳۶ء کو لکھا تھا۔ اقبال نامہ حصہ اول اور متعدد رسائل میں اس کی اشاعت ہو چکی ہے۔

سراپا جہد ہے۔ زندگی سے فرار نہیں۔

کائنات اور خودی کے درمیان اقبال مکمل مغائرت کے قائل نہیں۔ وہ مظاہر کائنات میں بھی خودی کی جلوہ آرائی اور عشق کی کارفرمائی دیکھتے ہیں۔ یہ خودی ہی ہے جو ہیرے کو کوئلہ سے اور موتی کو سنگریزے سے ممتاز کرتی ہے۔ مظاہر کائنات میں اثر آفرینی اور مدافعت کا جو تفاوت نظر آتا ہے۔ یہ ان کی خودی کے ضعف یا قوت ہی کا نتیجہ ہے۔ یہی خودی ہے جو شاہین اور کبوتر میں مختلف رنگوں سے جلوہ گر ہے۔ ظاہری پیکر کے لحاظ سے دونوں ایک مٹھی استخواں، پر اور پوست کا مجموعہ ہیں۔ لیکن یہ خودی ہے جو شاہین کو شاہین اور کبوتر کو کبوتر بناتی ہے اور یہ تفاوت مدارج دونوں کو بے چین رکھتی ہے۔ غرض ہوا کا چلنا پانی کی روانی، منتشر ذرات کا سمٹ کر سنگ خارا بننا، بیج کا بڑھ کر تناور درخت میں تبدیل ہونا، حیوان کے بچہ کا نشوونما حاصل کر کے ایک تنومند جانور کی شکل اختیار کرنا، زمین کا گھومنا، سیاروں کی گردشیں، یہ سب کیا ہیں۔ خودی کے جذبۂ عمل و ارتقا کا ایک ہلکا سا عکس۔ فرق صرف یہ ہے کہ اور مظاہر کائنات میں یہ جذبہ باشعور نہیں۔ ان کو وہ سوز و ساز آرزو حاصل نہیں جو انسان کا حصہ ہے۔ ان کے کمال کی رسائی بہت محدود ہے غرض اقبال کے نزدیک مظاہر کائنات اور انسان ایک ہی قافلۂ شوق کے مسافر ہیں۔ ان کے اندر ایک ہی جذبۂ عشق کی کارفرمائی ہے۔ مگر انسان کی ارتقا کا راستہ لامحدود ہے اور باقی مظاہر فطرت کا محدود۔

انسان کو مظاہر فطرت پر ایک اور افضلیت بھی حاصل ہے۔ اور وہ یہ کہ انسان خود اپنی ہی تکمیل نہیں کرتا بلکہ چاک گل و لالہ کو رفو بھی کر دیتا ہے۔ فطرت کو وہ جوں کا توں قبول نہیں کر لیتا بلکہ اس کو بناتا ہے، ڈھالتا ہے اور اپنے مقصد کے لئے استعمال کرتا ہے۔ رات

کی ظلمت کو چراغ کی ضو فشانی دیتا ہے۔ ریگزاروں کو چمن زار بناتا ہے۔ پوشیدہ قوت کے خزانوں کو اپنے کام میں لاتا ہے۔ غرض فطرت کے اندر جو نارسائی اور کمی تھی اس کو پورا کر دیتا ہے۔

اقبال کے فلسفے میں خدا اور زمانہ کا تعلق بھی خاص توجہ کا مستحق ہے۔ قدیم منکرین حق زمانہ یا دہر کو حادثات کا خالق اور زندگی اور موت کا مختار سمجھتے تھے۔ اقبال بھی زمانہ (یا سلسلہ روز و شب) کو نقش گر حادثات اور اصل حیات و ممات ماننے کو تیار ہیں لیکن اس اضافے کے ساتھ کہ زمانہ کی اصل خدا ہے۔ مانا کہ زمانہ ہر چیز کی اصل ہے۔ تسلیم کہ یہ عالم صفات اپنی نیرنگیوں کے لئے زمانے ہی کا رہینِ منت ہے۔ لیکن زمانہ کیا ہے محض ایک طرزِ بیان، ایک استعارہ، ایک پردہ جس کے پیچھے ذات خداوندی کارفرما ہے۔ کہتے ہیں فرانس کے مشہور فلسفی ہنری برگساں سے ملاقات کے وقت اقبال نے اس کو وہ حدیث سنائی، جس میں کہا گیا ہے "لا تسبوا الدھر ھو اللہ"، یعنی زمانے کو برا نہ کہو وہ خدا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اقبال خدا کو زمانے کی سطح پر لے آنا چاہتے ہیں۔ بلکہ زمانے کے حجاب کو ہٹا کر اقبال اس میں اللہ کی جلوہ گری اور کارفرمائی دیکھتے ہیں اقبال کے نزدیک وقت کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک زمان گزراں SERIAL TIME اور دوسرا زمان خالص PWRE DWRATION خودیِ مطلق زمان خالص میں وجود رکھتی ہیں اور زمان خالص میں وجود رکھنے کی وجہ سے زمان گزراں کی زنجیروں سے آزاد ہے اور اس کی کیفیات اور نیرنگیوں کی خالق [1]

یہ کائنات اقبال کے نزدیک عالم صفات یا مظہر شیون الہی ہے اس لئے کوئی مکمل یا قائم و جامد چیز نہیں بلکہ ہر لحظہ زیر تشکیل ہے۔ تخلیق کا عمل ختم نہیں ہوا۔ بلکہ دمادم صدائے کن

---

[1] اسلام میں مذہبی فکر کی نئی تشکیل صفحات ۵۱ - ۵۷۔

نیکوں آرہی ہے۔ ہر لمحہ نئی شانوں اور نئی اداؤں کی جلوہ گری ہے۔

خودی اور خدا کی بحث میں تقدیر کا مسئلہ بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اقبال اول تو عملی حیثیت سے اس مسئلے کو لیتے ہیں۔ خودی کی عملی فطرت اور اس کا جذبۂ عشق ہمیں بتاتا ہے کہ انسان اپنے عمل میں آزاد ہے۔ خود انسان عمل کرتے وقت یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کو دو راستوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کی آزادی ہے۔ منزل پر پہنچنے کے بعد جب انسان مڑ کر پیچھے دیکھے گا تو ممکن ہے اس کو ایک ہی راستہ نظر آئے جس کو وہ ناگزیر سمجھ لے۔ لیکن جاتے وقت اس کو ہر موڑ پر دو راہے ملتے ہیں۔ یہی انسان کے ارادہ اور اختیار کا عملی ثبوت ہے۔ لیکن ما بعد الطبیعیات کی سطح پر اقبال اس بحث کو ایک اور انداز سے اٹھاتے ہیں۔ خودی ہمارے اعمال کی اصل فاعل ہے اور خودی ماخوذ ہے۔ ذات خداوندی سے۔ اب اگر خودی اللہ سے اپنے تعلق کو یاد رکھ کر اس کی رضا کی خاطر کوئی عمل کرتی ہے تو اس کا ارادہ اور اختیار رضائے الٰہی سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے اور خودی مرضی الٰہی کا آلہ کار بن جاتی ہے۔ جب خودی اپنے آپ کو رضائے الٰہی کے سپرد کر دیتی ہے اور تمام مادّی خواہشوں اور زنجیروں سے اپنے آپ کو آزاد کر لیتی ہے تو اس میں ایسی قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ کوئی رکاوٹ اس کی راہ میں حائل نہیں ہو پاتی۔ جو عزم کرتی ہے وہ پورا ہو کر رہتا ہے جو مقصد لے کر اٹھتی ہے وہ حاصل ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ گویا مشیت خود اس کی رضا جوئی کی طالب ہوتی ہے اور نصرت خداوندی اس کی جلو میں چلتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں خدا خود بندہ سے پوچھتا ہے بتا تیری رضا کیا ہے۔

اب تقدیر کا سوال آتا ہے۔ بعض لوگ اس مسئلے کی یوں تفسیر کرتے ہیں کہ اللہ

نے کسی انسان کے متعلق جو کچھ تقدیر کردی وہ اٹل ہے۔ اس کے ارادہ اور عمل کو اسی راستے پر جانا ناگزیر ہے۔ اس تعبیر کو مان کر انسانی ذمہ داری باقی نہیں رہتی اور خیر و شر کا امتیاز بے معنی قرار پاتا ہے۔ اقبال اس مسئلے کا یہ حل پیش کرتے ہیں کہ تقدیر کو امکانات عمل کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ اب اگر ہم یہ کہیں کہ خدا نے ہمارے لئے یہ تقدیر کردی ہے کہ ہم شراب پئیں یا گناہ کے راستے پر چلیں تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ خدا نے ہمارے لئے صرف ایک راہِ عمل رکھی ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے ہم بدیہی طور پر یہ محسوس کرتے ہیں کہ عمل کی کئی راہیں ہمارے اوپر کھلی ہوئی ہیں۔ بہ الفاظ دیگر خدا نے ہمارے لئے ایک اٹل تقدیر نہیں کردی بلکہ بہت سی تقدیریں رکھی ہیں۔ اب یہ ہمارے ارادے اور ہمت پر ہے کہ ہم جس تقدیر کو چاہیں اپنائیں۔ غرض اقبال انسانی خودی کو صحیح معنوں میں اپنے ارادے میں مختار اور اپنے ارادے اور اعمال کا ذمہ دار تصور کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک مومن فقط احکام الہٰی کا پابند ہے اور نباتات و جمادات تقدیر کے پابند۔ یعنی نباتات و جمادات کے لئے ایک اٹل تقدیر اور ایک ناگزیر راستہ ہے جس پر ان کو چلنا ضروری ہے۔ لیکن انسان کے سامنے عمل کی کئی راہیں ہوتی ہیں۔ ان راہوں میں سے وہ رضائے الہٰی کی راہ کو بھی منتخب کر سکتا ہے اور مادی غلامی کی راہ کو بھی۔ اسی میں اس کی بے پایاں عظمت کے امکانات بھی ہیں اور بے انتہا پستی کے خطرات بھی۔

تقدیر کی تعریف اقبال یوں کرتے ہیں:۔

"وقت اپنے امکانات کے انکشاف سے پہلے تقدیر
کی حیثیت رکھتا ہے۔ نیز ہر چیز کی اندرونی رسائی یا وہ

امکانات جو اس کی فطرت میں ہر دے کار آنے
کے لئے تیار ہیں اس کی تقدیر ہیں"[1]

مثنوی کا پیغام گزشتہ صفحات میں ہم اقبال کے عام فلسفہ سے بحث کر چکے ہیں. اسی کی بنیاد پر وہ اپنے نظریۂ سیاست دینی کی تعمیر کرتے ہیں۔ یہ نظریہ دراصل خودی کے جذبۂ عشق یا لا الٰہ الا اللہ کے اجتماعی پہلو کی تفسیر ہے۔ لا الٰہ الا اللہ میں انسانی حریت کا ایک عظیم الشان اعلان ہے. اس میں اس بات کا عزم ہے کہ نہ ہم غلامی پر رضامند ہوں گے نہ کسی انسان کو غلام رہنے دیں گے۔ ہم ان فاسد نظاموں کو مٹائیں گے جن میں انسان دوسرے انسانوں کے خدا بن بیٹھے ہیں۔ ان نظاموں کو مٹا کر ہم ایک ایسے عادلانہ نظام کی تشکیل کریں گے جس کی بنیاد حریت، مساوات اور اخوت پر ہوگی۔ یہ ہے اقبال کی نظر میں سیاست دینی کا نصب العین۔ اسی نصب العین کی تشریح مثنوی "پس چہ باید کرد" میں کی گئی ہے۔ آیئے ذرا مثنوی کے پیغام اور اس کے اہم اجزا پر ایک مربوط شکل میں نظر ڈال لی جائے۔

تمہید اوّل اقبال اپنے ابتدائی قطعہ میں عصر حاضر کے مرض کی تشخیص کرتے ہوئے عقل کی سرکشی اور عشق سے بغاوت کو تمام خرابی کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں اور اس کا مقابلہ عشق و ایمان کی قوتوں سے کرنا چاہتے ہیں۔

پھر تمہید میں رومی کے فیض روحانی کا اعتراف کرتے ہوئے رومی کی زبان سے

---

[1] اسلام میں مذہبی فکر کی نئی تشکیل، صفحہ ۵۱۔

یہ پیغام کہلواتے ہیں کہ مشرق اب خوابِ غفلت سے بیدار ہو رہا ہے۔ وہ اب مغرب کے تسلّط اور غلامی پر رضامند نہیں۔ اس کے سینے میں ایک انقلاب کروٹیں لے رہا ہے۔ اس تحریک انقلاب کو مؤثر بنانے اور صحیح راستے پر لگانے کے لئے صحیح اصول وہدایات دینے کا یہی سب سے زیادہ سازگار وقت ہے۔ اس رہنمائی کے لئے اقبالؔ سے زیادہ اور کون موزوں ہو سکتا ہے۔ جو ایک طرف رومی کے میخانۂ عشق کے بادہ خوار ہیں اور دوسری طرف دانش مغرب کی آگ میں تپائے جا چکے ہیں۔

رومی اقبالؔ کو روح کی حقیقت اور اس کے نصب العین سے آگاہ کرتے ہیں۔ روح ایک علوی جوہر ہے جس کو تمنائے وجود اور خواہشِ اظہار اس عالمِ آب وگل میں لاتی ہے۔ اس کا نصب العین یہ نہیں کہ اپنی انفرادی نجات پر قانع ہو کر گوشۂ عافیت میں بیٹھ رہے یا ہستیٔ خداوندی میں اپنے آپ کو ضم کرنے کی کوشش کرے بلکہ کائنات کے لئے پیامِ رحمت بننا اس کا مطمحِ نظر ہے۔ اور اسی میں اس کی نشوونما مضمر ہے اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے اسے اگر ایک طرف انسانیت کی فلاح وبہبود کی کوشش کرنا ہے تو دوسری طرف ظلم وجور کی قوتوں سے ٹکرانا بھی ہے۔ اس کے بعد سیاست دینی کا بنیادی اصول بتاتے ہیں۔ یعنی کوئی انسان کسی انسان کا محتاج ومحکوم نہ ہو۔ اس کے ساتھ دو زریں اصول تعلیم کرتے ہیں جن پر کاربند ہونا اس منزل کے راہی کے لئے ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ اس مادی عالم میں دل کو نہ الجھایا جائے دوسرے نااہلوں کی صحبت سے پرہیز کیا جائے اور اپنا ہم راز وہم نشیں ان ہی کو بنایا جائے جن میں مقصد کی مشارکت ہے۔ ان دونوں اصولوں کی اہمیت ظاہر ہے۔ پہلے کے بغیر مقصد کی دھن اور خالص وفاداری پیدا نہیں ہوتی اور دوسرے کے بغیر کوئی

انقلابی پارٹی یا تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی۔

غرض رومی کی دعوت پر اقبال مشرق کی شبِ تاریک کو جگمگانے کا عزم لے کر اٹھتے ہیں۔ ان کے نزدیک مشرق کا سب سے بڑا مرض یہ ہے کہ اس کی فکر اور اس کے نظریات تابع غیر ہو کر اپنی پاکیزگی کھو بیٹھے ہیں۔ فکر کے خوار و خراب ہونے سے قوم میں نیک و بد کی پرکھ باقی نہیں رہتی اور وہ زندگی کی جدوجہد سے عاری ہو کر عیش و سکون تلاش کرنے لگتی ہے۔ اس لئے اقبال سب سے پہلے مشرق کی "تطہیرِ فکر" اور "تعمیرِ فکر" چاہتے ہیں۔ اس کے لئے وہ مہرِ عالم تاب سے کسبِ نور کی تمنا کا اظہار کرتے ہیں۔ مہرِ عالم تاب کا اشارہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے۔ جن کی سیرت اور تعلیمات میں ہمیں تعمیرِ انسانیت اور حریت کا سچا نصب العین ملتا ہے۔

ان تمہیدی مباحث کے بعد اقبال مثنوی کے مرکزی مقصد کی طرف رجوع ہوتے ہیں اور حکمت کلیمی یا سیاست دینی کی تشریح کرتے ہیں۔

حکمتِ کلیمی

موسیٰ کلیم اللہ نے قوم بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی اور اس کے جور و استبداد سے نجات دلائی تھی۔ اقبال کے نزدیک سیاست دینی کا سب سے بڑا مقصد یہی ہے کہ انسان کو انسان کی غلامی سے آزاد کیا جائے۔ فاسد اور ظالمانہ نظاموں کو ختم کر کے فطرت کے سچے اصولوں پر سوسائٹی اور زندگی کی تعمیر کی جائے۔ اسی لئے وہ اس کو حکمتِ کلیمی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

فلسفۂ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

اس سیاست دینی یا حکمت کلیمی کی بنیاد لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

پر ہے۔ کسی قوم کا لا الٰہ کہنا اعلان حرّیت کا مترادف ہے۔ یہ ہر اس نظام کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ جس میں انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم و محتاج ہو۔

فاسد نظاموں کو درہم و برہم کرنے کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نئے نظام زندگی کی تعمیر کن اصولوں پر کی جائے۔ اس تعمیری نصب العین کے لئے اور انسان کی ترقی و کمال کی صحیح سمت متعین کرنے کے لئے ہستیٔ کامل پر ایمان لانے کی ضرورت ہے۔ یہ ہے الا اللہ کی منزل۔

لا و الا دونوں زندگی کی تعمیر و ترقی کے لئے ناگزیر ہیں۔ لا میں تخریب اور حرکت کا پیغام ہے اور الا میں تعمیر اور سکون کا مژدہ۔ ان ہی دونوں سے زندگی کا احتساب ہوتا رہتا ہے اور نئی زندگی کے دروازے قوموں پر کھلتے ہیں۔ اپنے دعوے کی تائید میں اقبال تاریخ سے دو مثالیں پیش کرتے ہیں۔ ایک قدیم عرب اور دوسرے جدید روس کی۔

عرب کے بے سروسامان جاہل بدوی ایک دنیا پر چھا گئے تھے۔ پرانے دیوتاؤں کی خدائی کو انھوں نے ختم کیا۔ قیصر و کسریٰ کی شہنشاہیت کو مٹایا یہ سب لا کی کرشمہ سازیاں تھیں۔

اسی طرح زمانہ حال میں روس میں دبی اور گھٹی ہوئی انسانیت کے دل میں جذبۂ لا پیدا ہوا اور اس شدت کے ساتھ پیدا ہوا کہ اس نے ہر اقتدار کو ٹھکرا دیا۔ بادشاہ۔ خدا اور کلیسا سب کی نفی کر دی۔ لیکن اقبال کا عقیدہ ہے کہ زندگی لا کے مقام پر آکر ٹھہرتی نہیں۔ لا کے تخریبی پروگرام کے بعد الا کے تعمیری نظام کی ضرورت ہوتی ہے۔ ورنہ لا بغیر الا کے بربادی و ہلاکت کا پیغام

بن جاتا ہے۔

فقر غرض لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ پر سیاست دینی کی بنیاد ہے۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ میں جو اثبات اور نفی کے دو پہلو ہیں۔ یہ عشق اور فقر کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ عشق اور فقر پر سیاست دینی کی اساس ہے۔ عشق سے مراد ہے مقصود سے وابستگی۔ فقر کا منشاء ہے غیر مقصود سے بے نیازی۔ عشق کی کافی تفصیل و تشریح پہلے گزر چکی۔ فقر کی تعریف اقبالؔ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ فقر کیا ہے؟ "اک نگاہ راہ بیں اک زندہ دل"، فقر اندازۂ کارحیات" ہے لَآ اِلٰہَ سے فقر کو ثبات حاصل ہے۔ فقر وہ امانت ہے۔ جو محمد مصطفےٰ صلی اللّٰہ علیہ وسلم سے ہمیں پہنچی ہے۔ فقر کا ساز و برگ قرآن عظیم ہے۔ فقر بے سبب نفس کشی یا بے وجہ ترک دنیا کا مترادف نہیں بلکہ مقصد کی راہ میں ہر خوف محبت اور لالچ سے بے نیاز ہونا، ہر جابر اور ظالم قوت سے ٹکرانے کے لئے تیار رہنا فقر کا اقتضا ہے۔

فقر قرآن اور فقر کافر کا فرق اقبالؔ یوں واضح کرتے ہیں۔

فقر قرآن احتساب زندگی اور تسخیر کائنات کا مترادف ہے۔ وہ بندہ کو مولا صفات بناتا ہے اور اپنی ذات کو نورِ حق سے دیکھنا سکھاتا ہے۔ خودی کو حق کی کسوٹی پر کس کر اس کی عملی صلاحیتوں کو تیز کرتا ہے۔ حق کی خاطر جدوجہد کرنے اور راہِ حق میں موت کا استقبال کرنے کا جذبہ دیتا ہے۔

اس کے برخلاف فقر کافر کیا ہے؟ مستی و رقص و سرود۔ کمزوری و

محرومی و بے چارگی، جہاد زندگی سے بھاگ کر سکون غار و کوہ میں پناہ لینا۔ جسم کو گھلانے اور اپنی خودی کو ایک داشِ معصیت سمجھ کر مٹانے کی کوشش کرنا۔

مردِ حُر

عشق اور فقر کے رموز اور لا الٰہ الا اللّٰہ کا فلسفہ بتانے کے بعد اقبالؔ ایک مرد حُر کے مرتبہ اور منصب کی تشریح کرتے ہیں جس کا دل عشق و فقر کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے اور جس کا سینہ لا الٰہ الا اللّٰہ کے نور سے روشن۔ اس کے بازوؤں میں مژدۂ لاتخف سے بے پایاں قوت ہوتی ہے۔ وہ ہر طاقت سے نڈر ہوتا ہے اور ہر مصیبت سے بے پروا۔ وہ موت کو زندگی سمجھتا ہے۔ اور اس کا وجود موت کی دسترس سے بالاتر ہوتا ہے۔ وہ بندہ ہے مگر مولا صفات۔ وہ مادی دنیا میں رہتا ہے مگر آب و گل کی قیدوں سے آزاد اور بے نیاز ہو کر۔ وہ براہ راست سرچشمہ وجود سے فیض اور ہدایت حاصل کرتا ہے۔ وہ محمد مصطفٰے صلی اللّٰہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے عشق کی شراب پیتا ہے۔ دینی احکام اس کے لئے مرضی غیر کی خارجی بندشوں کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ وہ اپنی فطرت میں ان کی اصل دیکھتا ہے۔ وہ ہمہ کردار ہوتا ہے مگر کم سخن۔ صلح میں وہ محبت و رافت کا مجسمہ ہوتا ہے اور جنگ میں عزم و ثبات کا پیکر۔ اس کے ہاتھ میں قوموں کی تقدیر ہوتی ہے۔ اپنے عزم و عمل سے وہ زندگی کا نقشہ بدل دیتا ہے۔ مرد حر کی محبت کیمیا کا اثر رکھتی ہے۔ وہ دو مردوں میں بھی نصب العین کی تڑپ پیدا کر دیتا ہے۔ اور بے حس دلوں کو سوز آرزو بخش دیتا ہے۔ وہ غلاموں میں جذبہ حریت بیدار کرتا ہے اور ان کو موجودہ نظام سے غیر مطمئن کر کے ایک بہتر نظام کی تعمیر و تشکیل کا جذبہ عطا کرتا ہے۔ اگر کسی قوم میں ایک مرد حر بھی باقی ہے تو وہ خوار و ذلیل نہیں رہ سکتی۔ مسلمانوں کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ ان میں کوئی مرد حر باقی نہیں رہا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دل کج رو اور حق

ناپید ہو گیا اور سینے میں ذوق انقلاب سرد پڑ گیا۔ اپنی خودی کو بھول کر وہ طواف غیر میں مصروف ہو گئے۔ ویسے تو اقبال کا روئے سخن تمام اقوام ایشیا بلکہ تمام انسانوں کی طرف ہے۔ لیکن مسلمانوں کا ذکر اور ان کی حالت کا ماتم خاص طور سے اس لئے آتا ہے کہ وہ پہلے سے اس نصب العین پر ایمان رکھتے ہیں۔ مگر عملاً اس کو بھلا بیٹھے ہیں۔ اقبال ان کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دوسروں کی طرح مادی عیش و عشرت کو اپنا مقصود نہ بنا لینا تمہارے شایان شان نہ تھا۔ اب بھی وقت ہے کہ اپنے نفس کا احتساب کرو۔ اپنی خودی کو خنجر و شمشیر کی طرح تیز کر کے پنجۂ تقدیر کو سونپ دو اور انسانیت کی خدمت کے لئے وقف کر دو۔

غرض اقبال اقوام ایشیا کی پستی اور زبوں حالی کا حقیقی درماں اسی میں سمجھتے ہیں کہ کوئی مرد حراں میں پیدا ہو جوان کے بیڑے کو پار لگا دے۔ یہ کسی حسن ظن یا جذبۂ عقیدت پر مبنی تجویز نہیں بلکہ سنجیدگی سے سوچی اور سمجھی ہوئی راہ ہے۔ غور کیجئے تو کوئی قوم اپنی گری ہوئی حالت سے اسی وقت ابھرتی اور غلامی کے گڑھے سے اسی وقت نکلتی ہے۔ جب اسے کوئی صاحب عزم و یقین مخلص رہنما مل جاتا ہے۔ اب اگر اقبال کے تصور کا مرد حر ہاتھ آ جائے تو کون سی مہم ہے جو سر نہ ہو سکے گی۔ وحدت مشرق اور تعمیر انسانیت کے نصب العین کے لئے ایسے ہی رہنما کی ضرورت ہے۔

اسرار شریعت

اب تک سیاست دینی کے جو اصول اور حقائق بیان کئے گئے ہیں ان میں اہمیت اس چیز پر تھی کہ نظام باطل اور انسان پر انسان کی خدائی کو کیونکر ختم کیا جائے۔ اب اسرار شریعت کے ضمن میں اقبال وہ بنیادی اصول بیان کرتے ہیں جن پر صالح نظام حیات کی تعمیر ہو گی۔ قوانین شریعت اقبال کے نزدیک صرف مسلمانوں کے

مذہبی قوانین نہیں بلکہ انسانی فطرت کے وہ بنیادی اصول ہیں۔ جو تمام انسانوں کی رہنمائی کا حق رکھتے ہیں۔ یہ فطرت صالحہ کے وہ تقاضے ہیں۔ جو محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاکیزہ قلب پر منکشف ہوئے ہیں۔ غرض شریعت کے وہ بنیادی اصول جن پر اقبال سوسائٹی کی تعمیر چاہتے ہیں حسب ذیل ہیں۔

اول تو یہ کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محتاج اور محکوم نہ ہو۔ یعنی انسان کا سر خدا کے سوا کسی کے آگے نہ جھکے اور وہ اپنی صحیح عظمت کو پہچانے۔

دوسرے ہر انسان اکل حلال یا جائز اور پاکیزہ روزی کا پابند ہو۔ بہ الفاظ دیگر اپنے آپ کو ایک ذمہ دار ہستی سمجھے جسے قانون الٰہی اور قانون اخلاق کی روشنی ہی میں اپنی ضروریات زندگی کو پورا کرنا ہے۔

تیسرے انسان مال و دولت کا اپنے آپ کو امین سمجھے مالک نہیں۔ یعنی یہ یاد رکھے کہ میری زندگی کا ایک مقصد ہے۔ اسی مقصد کے لئے تمام صلاحیتیں اور مال و دولت مجھ کو دیا گیا ہے۔

یہ تینوں اصول براہ راست عقیدۂ لا الٰہ الا اللہ سے ماخوذ ہیں۔ بہ ظاہر یہ نہایت سادہ سے اصول ہیں لیکن زندگی کے سارے فساد اور سوسائٹی کی ساری خرابیاں ان ہی کو نظر انداز کر دینے کا نتیجہ ہیں۔

حکمت فرعونی

مثنوی "پس چہ باید کرد" کے ضروری اجزا تو زیر بحث آچکے لیکن بعض چیزیں ہیں جن سے بالواسطہ اقبال کے فلسفہ و پیغام پر روشنی پڑتی ہے اس لئے مختصراً ان کا ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً حکمت کلیمی کے ساتھ ساتھ

اقبال حکمت فرعونی یا لادینی سیاست کے اصول اور طریقۂ کار سے بھی ہمیں روشناس کراتے ہیں۔

اس حکمت فرعونی یا لادینی سیاست کی بنا مادّیت پر ہوتی ہے۔ مادّیت سے انسان زندگی کے صحیح نصب العین اور کائنات کے حقیقی معنی تک نہیں پہنچ سکتا۔ درحقیقت جب انسان نورِ حق کی مدد سے دیکھتا ہے تب اسے اپنی ذات کا صحیح مقصد اور دوسرے انسانوں اور کائنات کے ساتھ اپنی ہستی کا صحیح تعلق نظر آتا ہے اسی طرح جب کوئی قوم نورِ حق سے محروم ہوتی ہے تو دوسری قوموں کو غلام بنانا اور اپنے مادّی نفع کے لئے انکو استعمال کرنا اس کا مقصد ہو جاتا ہے۔ مقصد کے حصول کے لئے ہر مکر و فریب اس کے نزدیک جائز ہوتا ہے۔ غلامی کی زنجیروں کو مضبوط کرنے کے لئے مختلف تدابیر عمل میں لائی جاتی ہیں۔ قوم کے اندر پھوٹ ڈلوا کر کچھ غدار اپنے مفاد کی تائید کے لئے حاصل کئے جاتے ہیں۔ نظام تعلیم کو ایسے سانچے میں ڈھالا جاتا ہے کہ غلامانہ ذہنیت کے وفادار پیدا ہوں۔ مذہبی رہنماؤں کو ہاتھ میں لے کر ان سے اپنی تائید اور استحکام کا کام لیا جاتا ہے۔ کبھی محکوم کو تن آسانی کا ذوق دلا کر اور خطرات زندگی سے خوفزدہ کر کے اپنے سایۂ عاطفت میں رہنے کی دعوت دیجاتی ہے۔ کبھی تہذیب و شائستگی سکھانے کے بہانے سے، کبھی تجارت اور سوداگری کے حیلہ سے قوموں کی آزادی کو سلب کیا جاتا ہے۔ اس لادینی سیاست کا ایک بڑا حربہ یہ ہے کہ اپنے مکروہ مقاصد کو رنگین اور دلکش پردوں میں چھپا دیتی ہے۔ ملوکیت اور استبداد پر جمہوریت کی رنگین نقاب ڈال دی جاتی ہے۔ شہنشاہیت اور سلطنت کے عزائم کو جامع اقوام کے معصوم نام کے پردہ میں چھپا دیا جاتا ہے۔

اس لادینی سیاست کے پھندے میں پھنس کر قوم کی جو حالت ہوتی ہے وہ قابلِ عبرت ہے۔ جسموں کے ساتھ ذہن بھی غلامی کی زنجیروں میں بندھ جاتے ہیں۔ آزادی کی تڑپ اور خودی کا احساس مٹ جاتا ہے۔ غلام افراد چاہے علم و فن سے کتنے ہی آراستہ ہوں حق کی فہم ان میں باقی نہیں رہتی۔ سینہ بہتر زندگی کی آرزو سے خالی ہوتا ہے۔ بوڑھوں میں شرم و غیرت باقی نہیں رہتی۔ نوجوان عورتوں کی طرح خود آرائی میں مصروف ہوتے ہیں اور لڑکیاں دلربائی اور دلفروشی میں منہمک۔ غرض ساز و سامان دنیا کی محبت، موت کا ڈر، عشرتِ امروز کی جستجو اور مستقبل سے بے نیازی اس نفسیات غلامی کی نمایاں خصوصیات ہوتی ہیں۔ اقبال غلامی کو سب سے بڑی لعنت سمجھتے ہیں۔ غلام کی نمازیں بے حضورِ قلب ہوتی ہیں اور اس کا سجدہ محض ایک رسم کہن۔ مختصر یہ کہ غلامی اور لذتِ ایمان ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں۔

اقوامِ مشرق کیلئے راہِ عمل

غلامی کی شرم دلا کر اقبال اقوامِ مشرق کو مغرب کے تسلط سے آزاد کرنا چاہتے ہیں۔ مغربی سیاست کے فریبوں اور حربوں کا ذکر کر کے ان سے متنبہ کرنا چاہتے ہیں۔ حکمتِ کلیمی کے اصول بتا کر ان میں حریت کی تڑپ اور مردِ حر بننے کا جذبہ بیدار کرنا چاہتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ بعض اہم مشورے اور عملی ہدایات بھی دیتے ہیں جو اس جہادِ حریت میں معاون ہوں۔ مثلاً

مغربی افکار اور نظریوں کی قید سے ذہن کو آزاد کیا جائے۔

ایشیا مغرب کے ساتھ اپنی اقتصادی اور تجارتی نیاز مندی کو ختم کرے چاہے لبوں پر جان آجائے چاہے اشد ترین ضروریاتِ زندگی کے بغیر رہنا پڑے لیکن مغرب

کا زیر بار منت نہ ہو۔ مغرب کے تنعمات اور عیش و عشرت کے ساز و سامان کو اپنی آزادی اور عافیت کا دشمن تصور کرے۔ غرب کے رنگین شیشوں سے کام نہ رکھے اپنی مٹی سے اپنے جام و ساغر بنائے۔

اقبال کا پختہ عقیدہ ہے کہ کوئی نظام جس کی بنیاد مادیت اور لادینی پر ہو دیرپا نہیں ہو سکتا۔ وہ نظام مغرب کی سست بنیادی دیکھتے ہیں۔ وہ مشرق کو پیغام دیتے ہیں کہ وہ اس تہذیب لادینی کو غرق کر دے۔ اور اس ساز میں مشرق کی لے پھونک دے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اس حقیقت کی طرف توجہ بھی دلاتے ہیں کہ محض پیغام حق کا حامل ہونا کافی نہیں۔ حق کی زندگی قوت سے ہے اور قوت تنظیم و جمعیت سے حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے حصول مقصد کے ظاہری ذرائع کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔

امت عربیہ سے خطاب اگرچہ اقبال کا روئے سخن تمام ممالک ایشیا کی طرف ہے لیکن امت عربیہ کو وہ خاص طور سے اپنے پیغام کا مخاطب بناتے ہیں اس لئے کہ وہ ایک بار اس امانت کا بوجھ اٹھا چکی ہے اور دنیا کو اخوت و حریت کا سبق دے چکی ہے۔ دوسرے اقبال کا عقیدہ ہے کہ مرد صحرا ہی فطرت کے رازوں کا امین اور پاسبان ہو سکتا ہے۔ کہنہ و بوسیدہ تہذیب و تمدن کی حامل قومیں اس پیغام کا حامل بننے کی صلاحیت کم رکھتی ہیں۔

حضور رسالت مآب میں مثنوی کے شروع میں مہر عالم تاب سے کسب نور

کی تمنا تھی۔ مثنوی کے اختتام پر پھر اقبال اسی آفتاب رسالت کے حضور میں عرض حال کرتے ہیں۔

اقبال اس وقت اپنی عمر کی آخری منزل میں تھے۔ ان کو اس بات کا احساس تھا کہ آفتاب عمر لب بام آجانے کی وجہ سے وہ مرد حر کے منصب کی ذمہ داریوں کا بار اٹھانے کے قابل نہیں۔ لیکن ایک چیز پر ان کو ناز ہے اور وہ ہے ان کا دل جو سوز یقیں سے بہرہ ور ہے اور نور عشق مصطفےٰ سے ضو فشاں اسی دل کا واسطہ دے کر بڑے تڑپتے ہوئے انداز میں کہتے ہیں کہ مجھے پرکھ کر دیکھ لے میں بدگوہر نہیں ہوں۔ تیرے پیغام پر ایمان رکھتا ہوں تو میری عملی کوتاہیوں کو دور کر دے۔ اور میری ہستی کو تلوار کی سی تیزی عطا کر دے۔ یا کلید کی سی فتح باب کی قوت۔ مطلب یہ ہے کہ یا تو عملی جہاد کی توفیق ارزانی ہو یا میرا پیغام ذہنوں کی بستہ گرہیں کھول کر دوسروں کو جہاد حریت پر آمادہ کر دے۔ واقعات شاہد ہیں کہ پہلی دعا کی مقبولیت تو مشیت الٰہی کی مصلحتوں سے ہم آہنگ نہ ہو سکی۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ دوسری آرزو کے پورا ہونے کا وقت نزدیک ہی ہو۔

اس مثنوی کو اردو کا جامہ پہنانے کا مقصد یہی ہے کہ شاید یہ نغمے اہل مشرق کی تطہیر فکر کا ذریعہ بن کر ان میں جذبۂ حریت بیدار کر سکیں اور وحدت مشرق اور آزادی ایشیا کے خواب کی تعبیر نزدیک لا سکیں ؎

تا تو بیدار شوی ناله کشیدم ورنه
عشق کار لیست که بے آه و فغاں نیز کنند

ظفر احمد صدیقی

کتاب پڑھنے والے سے

لاؤں گا سپاہِ نو عشق کی ولایت سے
ہے حرم میں پھر خطرہ عقل کی بغاوت سے

قامت خرد پر ہے جامۂ جنوں موزوں
ہے زمانہ ناواقف آہ اس حقیقت سے

فیض سے جنوں کے میں اس مقام پر پہنچا
عقل بھی جھکاتی ہے سر جہاں عقیدت سے

بے حساب و میزاں کب عقل چھوٹ جائے گی
مردِ حُر کی نظریں بھی کم نہیں قیامت سے

تمہید

پیرِ رومی مرشدِ روشن ضمیر — کاروانِ عشق و مستی کا امیر

اس کی گردِ راہ ماہ و آفتاب — کہکشاں ہی اُسکے خیمہ کی طناب

نورِ قرآں سے ہی روشن اسکا دل — اس کے آئینہ سے جامِ جم خجل

نے نوازی کا یہ اس کی سحر تھا — میرے دل میں شورِ محشر جاگ اٹھا

یوں کیا معجز نما لب سے خطاب — رُوحِ مشرق میں ہی پیدا انقلاب

اٹھ رہے ہیں رازِ ہستی سے حجاب — چشمِ خاور اب نہیں سرشارِ خواب

جذبہائے نو سے ہی وہ بہرہ مند — ٹوٹتے جاتے ہیں کہنہ قید و بند

اے کہ ہی تو محرمِ اسرارِ غرب
تجھ پہ روشن اندک و بسیارِ غرب

کون ہے اس دور میں تیرے سوا
جو حریفِ آتشِ مغرب ہوا

اے کہ ہی تو وارثِ دینِ خلیل
تازہ کر دنیا میں آئینِ خلیل

ہو کے جذبِ لا الٰہ سے تیز دست
ہر کہن بت خانہ کو کر دے شکست

زندگی قوموں کی ہی جذبِ دروں
کم نظر اس جذب کو سمجھا جنوں

کوئی ملت راز رفعت کی امیں
بے جنونِ دو فنوں ہوتی نہیں

ہے اسی سے شوق کی نشو و نما
ہے یہی عزم و توکل کی بنا

ہے یہی مومن کی قہاری کا راز
کفر و ایماں میں اسی سے امتیاز

قلبِ مومن ہے عیارِ خوب و شر
اس کی نظروں سے جہاں زیر و زبر

ضرب سے کہسار اس کی چور چور
آستیں میں اس کی آشوبِ نشور

تو ہے میرے میکدے کا بادہ خوار
تجھ سے تازہ میرے گلشن کی بہار

باغِ عالم سے گزر دامن کشاں
مثل بوئے غنچہ مستور و عیاں

عصر ہے یہ ناشناسِ رمزِ جاں
حبّ غیر اللہ جانوں میں نہاں

فلسفی کو بھی نہیں تہ کی خبر
ہے اسیر آب و گل اس کی نظر

آنکھ شمعِ دل سے جو روشن نہ تھی
رنگ و بو ہی میں الجھ کر رہ گئی

اے خوشا دل غیر سے جو ہے تہی
ماسوا کی جس نے بیڑی توڑ دی

صحبتِ ناکس سے لازم ہے ابا
کم بنا ہمراز شیروں کے سوا

کیا سمجھ سکتی ہے فکرِ گوسفند
شیر کی فطرت کے اسرارِ بلند

رکھ نہ مردِ سفلہ کی صحبت سے کام
ہو اگرچہ بادشاہِ روم و شام

ہو دہانِ گرگ میں یوسف نہاں
اس سے بہتر ہے کہ یہ جنسِ گراں

دہر کی ناقدریوں کا ہو شکار　　مول لے یا کوئی مرد کم عیار

اہل دنیا بے تخیّل بے قیاس　　کشتۂ ظاہر حقیقت ناشناس

کیا ہی خوب اک مرد فارس نے کہا　　روح اتبک جس سے ہی دردآشنا

"نالۂ[1] عاشق بگوش مردم دنیا

بانگ مسلمانی و دیار فرنگ است"

معنی و دین و سیاست کر عیاں　　اہل حق پر یہ حقیقت کر عیاں

"غم[2] خور و نانِ غم افزایاں مخور　　زانکہ عاقل غم خورد، کودک شکر"

رکھ سبک سیر آپ کو مثلِ صبا　　لے نہ ساماں نکہت گل کے سوا

---

[1] (ترجمہ) اہل دنیا کے کانوں کے لئے نالۂ عاشق ویسی ہی اجنبی چیز ہے جیسے دیار فرنگ میں اذان کی آواز

[2] یعنی فقر و فاقہ کی تکلیف سہ لینا بہتر ہے اس سے کہ تکلیف پہنچانے والوں کے ہاتھوں سے روٹی قبول کی جائے۔ صاحب عقل میں بچہ میں یہی فرق ہے کہ بچہ شکر کھانا چاہتا ہے (خواہ اسکے لئے مضر ہو) اور عاقل ایسے موقع پر صبر کرنا بہتر سمجھتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اہل باطل کے نظام پر کسی حال میں راضی نہ ہو۔

خرقہ خود ہے بار دوشِ فقر پر　　مردِ مومن بس خدا پر رکھ نظر

تیری فطرت میں یم و طوفاں بھی ہے　　اور سکونِ روح کا ساماں بھی ہے

مثلِ قلزم دشت و در کو کر زبوں

مثلِ شبنم ہر گِ گل کو دے سکوں

اے کہ ہے رمز آشنا تیری نظر　　روحِ مومن کی بھی ہے تجھ کو خبر

روح کیا اک قطرہ شبنم کی نمود　　مضطرب جس میں تمنائے وجود

اپنے ہاتھوں اپنا عقدہ کر کے وا　　ہو گئی اس کی خودی جلوہ نما

اپنے دل کی خلوتوں میں بیٹھ کر　　ادجِ گردوں سے کیا عزمِ سفر

جس کی ہمت کو نہ آیا یہ پسند　　مثلِ گوہر ہو صدف میں جا کے بند

جس کی غیرت نے نہ فرمایا قبول　　بحرِ بے پایاں کی وسعت میں شمول

منظر گلشنِ پہ ہنگامِ سحر پہلے بے تابانہ اک ڈالی نظر

پھر سنایا زندگانی کا پیام

غنچہ کو بخشا حیاتِ نو کا جام

مہرِ عالمتاب سے خطاب

اے امیرِ خاور اے مہرِ منیر — ذرہ ذرہ تجھ سے ہی روشن ضمیر

ہے تجھی سے سوز و ساز ہر وجود — تجھ سے ہر پوشیدہ کو ذوقِ نمود

جوئے سیمیں میں تری کشتی زر — ہے یدِ بیضا سے بھی رخشندہ تر

ہے ترے پرتو سے نورِ ماہتاب — لعل اور گوہر میں تیرے دم سے آب

تیرے باعث لالہ کا سوزِ دروں — سینۂ گل میں تجھی سے موجِ خوں

تیرے دم سے سبزہ کو ذوقِ نمو — دیدۂ نرگس کو تیری آرزو

مرحبا اے قاصدِ فرخندہ فر — رشکِ نخلِ طور تجھ سے ہر شجر

صبح نو کا نوجہاں کو ہے پیام — جگمگا دے میری بھی تاریک شام

تیرہ خاکستر کو میری نور کر — اپنے جلووں میں مجھے مستور کر

تاکہ گرماؤں دلِ احرارِ شرق — جگمگا اٹھے شبِ افکارِ شرق

میرے نغمے پختہ کر دیں خام کو — رنگ نو دیں گردشِ ایّام کو

فکر ہو مشرق کی آزادِ فرنگ — میرے نغموں سے ہوا سکا آب و رنگ

زندگی ہے گرمیِ ذکر[1] اور بس — حرّیت ہے عفّتِ فکر[2] اور بس

فکر ہو جس قوم کی خوار و خراب — اس کے ہاتھوں میں ہے مٹی سیم ناب

سینہ میں مرجاتا ہے قلبِ سلیم — کج نظر آتی ہے راہِ مستقیم

بے نیازِ حرب و ضربِ کائنات — ہے سکوں اس کیلئے اصلِ حیات

---

[1] یعنی تمام اعمال زندگی میں اللہ اور اس سے اپنے تعلق کو یاد رکھنا۔

[2] یعنی فکر و ذہن کا باطل نظریوں سے پاک ہونا۔

بحر اس کا موج سے نا آشنا اس کے موتی ہیں خذف کے ہم بہا

سب سے پہلے چاہیئے تطہیر فکر
اُسکے بعد آسان ہی تعمیر فکر

حکمتِ کلیمی

ہے نبوت امرِ حق کی پاسدار
لائے کیا نظروں میں حکمِ شہریار

قصرِ شاہی اسکو ہے اک کہنہ دیر
ننگ اس کو بندگیٔ حکمِ غیر

پختہ اس کے فیض سے ہر ایک خام
گرم اس سے کارزارِ صبح و شام

اس کا درس اللہ بس باقی ہوس
اس کا شعلہ دشمنِ ہر خار و خس

آتش افروز اس کے نم سے شاخِ تاک
مشتِ خاک اُسکی نظر سے جانِ پاک

معنیِ جبریل و قرآں ہے وہی فطرۃ اللہ[1]، کا نگہباں ہے وہی
واقفِ رازِ نہاں اس کا ضمیر اس کے سوزِ دل سے امت کا خمیر
حکمراں، پر بے نیازِ تخت و تاج بے کلاہ و بے سپاہ و بے خراج
ہے خزاں اسکی توجہ سے بہار بادۂ ناب اس کی تلچھٹ پر نثار
اس کی آہِ صبحدم رازِ حیات اس کے جلووں سے جمالِ کائنات
بحر و بر طوفان سے اسکے خراب ہر نظر اس کی پیامِ انقلاب
دیکھئے "لاخوف علیھم[2]" کا پیام خوف و غم کرتا ہے انساں پر حرام

[1] تلمیح آیۂ قرآنی "فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا" (ترجمہ) اللہ کی فطرت جس پر اللہ نے تمام انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو اصول صحیحہ انسان کی فطرت میں ودیعت کئے ہیں۔ نبی ان کا صحیح نبض شناس ہوتا ہے اور ان کو بروئے کار لاتا ہے۔

[2] تلمیح ہے آیۂ قرآنی کی طرف۔ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ یعنی مومن خوف و غم سے پاک ہیں۔

دیکے درس عزم و تسلیم و رضا
کرتا ہے آئینۂ دل کی جِلا

جانے کیا اعجاز کر دیتا ہی وہ
وقفِ سوز و ساز کر دیتا ہی وہ

پتھر اس کے فیض صحبت سے گہر
مخزنِ حکمت تہی مغزوں کے سر

بندۂ درماندہ سے کہتا ہی ہاں
ہر بت کہنہ کو کر دے بے نشاں

توڑ دے یہ دیر کہنہ توڑ دے
ربی الاعلیٰ کے جذب و سوز سے

چاہتا ہے فقر کی دولت اگر
شکوۂ جور تہی دستی نہ کر

عافیت کا میں تبا دوں تجھ کو راز
صدق و اخلاص و نیاز و سوز و ساز

رکھ نہ قصر کیقباد و جم سے کام
مرد حُر اپنی خودی میں کر مقام

کر نہ ننگ کرگسی ہرگز قبول
تو ہے شاہیں اپنی ہستی کو نہ بھول

غور تو کر طائرانِ گلستاں
اپنی مرضی سے بنائیں آشیاں

اے کہ تیری فکر ہے گردوں مسیر — تو ہو مرغانِ چمن سے بھی حقیر

اپنی مرضی سے جہاں تعمیر کر — پھر زمین و آسماں تعمیر کر

ہو کے مومن مرضیِ حق میں فنا — خود ہی بن جاتا ہے تقدیرِ خدا

اس کے قلبِ پاک سے پھر ایکبار — پاتے ہیں تشکیل یہ لیل و نہار

ہو رضائے حق میں گم مثلِ سلف — اپنے گوہر کو کر آزاد صدف

ظلمت آگیں ہے جہانِ سنگ و خشت — آنکھ کو رکھ حاملِ نورِ سرشت

گر نہیں حاصل جلالِ حق تجھے — مل نہیں سکتا جمالِ حق تجھے

ابتدائے عشق و مستی قاہری — انتہائے عشق و مستی دلبری

مردِ مومن مظہرِ شانِ وجود — مردِ مومن کے سوا ہر شے نمود

لا الٰہ کا سوز ہو دل میں اگر — اس کے فرمانبر ہیں خورشید و قمر

حکمتِ فرعونی

اہلِ دیں کی ہو چکی حکمت عیاں　　حکمتِ اربابِ کیں کا سن بیاں

حکمتِ اربابِ کیں ہے مکر و فن　　مکر و فن، تخریبِ جاں تعمیرِ تن

منحرف ملت سے، دشمن دین کی　　ناشناسا شوق کے آئین کی

دیتی ہے مکتب کو کچھ ایسا نظام　　خیر خواہ خواجہ ہو جس سے غلام

شیخِ ملت کی حدیثِ دل نشیں　　کرتی ہے اس کے لئے تحریفِ دیں

اس کے دم سے وحدتِ قومی دو نیم　　ہے جواب اس کا فقط چوبِ کلیم

وائے ملت کشتۂ تدبیرِ غیر　　وقفِ تخریبِ خود و تعمیرِ غیر

علم و فن میں ہے عمیق اس کی نظر — ہے مگر اپنی خودی سے بے خبر

نقشِ حق سے اُسکی لوحِ دل کو عار — اس کا سینہ آرزوؤں کا مزار

ہے تہی دامن غیور اولاد سے — مُردے بہتر قوم کے افراد سے

شرم سے بیگانہ پیرانِ کہن — نوجواں آراستہ مانند زن

زندگی ان کی اجل سے ہم کنار — آرزو کی بے ثباتی کا شکار

لڑکیاں خود اپنی زلفوں میں اسیر — شوخ چشم و خود نما و خوردہ گیر

دلفریب و دلرباؤ دلفروش — رہزن ایمان و عقل و صبر و ہوش

ساعدِ سیمیں کی وہ تابانیاں — ابر میں جیسے چمکتی بجلیاں

قوم، خاکستر ہے جس کی بے شرر — صبح اس کی شام سے تاریک تر

ہر گھڑی اس کو تلاشِ ساز و برگ — ہر نفس فکرِ معاش و خوفِ مرگ

منعم اسکے بخل کیش و عیش مست　　غافل اصلیت سے اور ظاہر پرست

قوت فرمانروا کے یہ غلام　　اختلال دین و ایماں انکا کام

غافلِ تعمیر مستقبل ہیں یہ　　عشرتِ امروز کے قائل ہیں یہ

عظمت اسلاف کے ہیں نغمہ خواں　　بے عمل گفتار ان کی الاماں

ان کا مذہب الفت اندازِ غیر　　یعنی خشتِ کعبہ سے تعمیرِ دیر

قوم جس نے پھیر لی حق سے نظر

مُردہ ہے اپنی اجل سے بے خبر

لا الٰہ الا اللہ

یاد رکھ یہ نکتۂ مردان حال — لا ہے قوموں کا جلال، الا جمال

لا و الّا احتساب کائنات — لا و الّا فتح یاب کائنات

ہیں یہ تقدیر جہان کاف و نون — لا سے حرکت اور الّا سے سکون

ہو نہ جب تک لا الٰہ سے تیز دست — بند غیر اللہ نہیں ہوتا شکست

لا ہے رزم زندگی کی ابتدا — ہے یہ پہلی منزل مرد خدا

قوم جو اس سوز سے واقف ہوئی — اس نے پھر اپنی خودی تعمیر کی

پیش غیر اللہ لا کہنا حیات — ہے اسی سے تازہ رزم کائنات

لیکن اس کا اہل ہر اک دل نہیں ہر خس اس کے شعلہ کے قابل نہیں

ایک دل بھی اس سے گر سرشار ہو لاکھ گم گشتوں کا بیڑا پار ہو

بندہ خواجہ سے ابھی ہو ہم نبرد لا سے گر مائے جو اس کا خون سرد

جس کا دل اس سوز سے ہو آشنا ہے جلال اس کا قیامت سے سوا

لا مقام ضربہائے پے بہ پے صور محشر ہے، نہیں یہ شور نے

ہے شکستہ اس سے ساز ہست و بود

تا ہو تو آزادِ گرداب وجود

مجھ سے سن احوال ایام عرب تا عیاں ہو پختۂ وخام عرب

چور چور اس نے کئے لات و منات تھا جہاں میں رہ کے آزاد جہات

اسکے ہاتھوں ہر قبائے کہنہ چاک اسکے ہاتھوں قیصر و کسریٰ ہلاک

گاہ اس کی برق دشت و در کے پار
گہ سمندر اس کے طوفاں کا شکار

مثلِ خس تھا اس کی آتش میں جہاں
تھیں یہ سب لا کی کرشمہ سازیاں

تھا یہ اسکے سوزِ پیہم کا اثر
ہو گیا اک عالمِ نو جلوہ گر

بانگِ حق اس کی سحر خیزی سے ہے
یہ بہار اس کی عرق ریزی سے ہے

یہ چراغِ لالہ جو ہے جلوہ بار
ہے کنارِ جو سے اس کے مستعار

لوحِ دل کو کر کے غیر اللہ سے پاک
بن گئی صد حشر بر دوش اسکی خاک

دیکھ چشمِ غور سے حالِ فرنگ
بندگی تھی خواجگی سے وقفِ جنگ

روس کا قلب و جگر جب خوں ہوا
اس کے باطن سے اٹھی آوازِ 'لا'

کیا کہوں میں اسکی چیرہ دستیاں
نظمِ عالم کی اڑا دیں دھجیاں

میں نے کی ہے اسکی حالت پر نگہ — لاسلاطین، لاکلیسا، لاالٰہ

لا کی تیز و تند رو میں بہہ گیا — پائی آنکھوں نے نہ الا سے ضیا

دیکھنا اک روز یہ جوشِ جنوں — پائے گا آغوش الا میں سکوں

لا پر آکر رک نہیں سکتی حیات — سوئے الا ہے خرام کائنات

لا و الا سے ہی قوموں کا نظام — لا بغیر الا تباہی کا پیام

کیسے ہو پختہ محبت میں خلیل — ہو نہ جبتک لا سوئے الا دلیل

اے کہ حجروں میں ہی تو گرم سخن — ضرب لا سے توڑ یہ دیر کہن

لے نہ اک جو کو جہان خشک و تر — ہو جلال لا الہ سے باخبر

ہاتھ میں جس کے بھی ہے شمشیر لا

ہی وہ موجودات کا فرمانروا

فقر

فقر کیا ہے اے اسیر آب و گل — اک نگاہ راہ بیں، اک زندہ دل

فقر ہے اندازۂ کار حیات — لا الہ سے فقر کو حاصل ثبات

فقر خیبر گیر با نان شعیر — فقر کے فتراک میں سلطان و میر

فقر ذوق و شوق و تسلیم و رضا — ہم امیں ہیں یہ متاع مصطفےٰ

ہیں ملائک اس کے ناوک کا شکار — فقر سے اسرار قدرت آشکار

اوج خورشید و قمر دیتا ہے فقر — شیشہ کو الماس کر دیتا ہی فقر

فقر کی حد تو سمجھتا ہے گلیم — ساز و برگ اسکا ہی قران عظیم

بزم میں ہر چند ہے وہ کم سخن
ہے اسی سے گرمیٔ صد انجمن

بے پروں کو ذوقِ پرواز اس سے ہے
پیشہ میں تمکین شہباز اس سے ہے

بادشاہوں سے الجھتا ہے فقیر
بوریئے سے اسکے لرزاں ہیں سریر

ہے جنوں سے اسکے شورِ کائنات
خلق کو دیتا ہے ظلموں سے نجات

اس بیاباں ہی میں کرتا ہے مقام
ہے جہاں شاہیں سے چابک تر حمام[1]

دل میں اسکے قوتِ جذب و سلوک
پیش سلطاں اسکے لب پر لا ملوک

آتشِ دل، تیز اسکی خاک سے
شعلہ کم، اسکے خس و خاشاک سے

ہو نہیں سکتی وہ ملت خوار و پست
ایک بھی باقی ہے جس میں حق پرست

اسکے استغنا سے ملت سرفراز
شوق سے اسکے، دلوں کا سوز و ساز

---

[1] حمام۔ کبوتر

دیکھ اس آئینہ میں اپنی خودی — تا عطا ہو تجھ کو حق کی روشنی

حکمت دیں دلنوازی فقر کی — قوت دیں بے نیازی فقر کی

تھا یہ فرمانِ رسول دوسرا — "میری مسجد ہے تمام ارضِ خدا"

الاماں اے دورِ چرخِ فتنہ زا — مسجدِ مومن پہ قبضہ غیر کا

بندۂ مومن کو ہے راحت محال — ہو نہ جبتک مسجد مولیٰ الجلال

ہے صلاح ترک دنیا کس لئے — ترک کرنا ہے تو کر تسخیر اسے

قید آب و گل سے گر ہے چھوٹنا — بنکے راکب اس کا ہو اس سے رہا

صید مومن ہے طلسمِ روزگار — باز سے کہتا ہے "چھوڑ اپنا شکار!"

یہ معمہ میں سمجھ سکتا نہیں — کس لئے شاہیں ہو مانوسِ زمیں

وائے شاہیں جس نے شاہینی نہ کی — جسکے پنجے میں نہ صید آیا کوئی

وسعت افلاک سے نا آشنا

زار و خستہ آشیاں ہی میں رہا

فقر قرآں احتساب ہست و بود — فقر کافر مستی و رقص و سرود

فقر مومن کیا ہے؟ تسخیر جہات — بندہ اسکے فیض سے مولیٰ صفات

فقر کافر، خلوت دشت و جبل — فقر مومن، بحر و طوفاں در بغل

زندگی اِسکی سکون غار و کوہ — زندگی ہے اُسکی مرگ باشکوہ

راہِ حق میں جسم سے اِس کو گریز — اور خودی اُس کی فسان حق پہ تیز

ہے خودی اِس کی وہ داغ معصیت — ہے مٹا دینا ہی جس کا مصلحت

اور خودی اُس کی چراغ ضوفشاں — جس کی تابانی سے روشن ہے جہاں

فقر عریاں ہو اگر زیر سپہر — خوف سے لرزاں ہوں اسکے ماہ و مہر

فقر عریاں گرمیٔ بدر و حُنین　　فقر عریاں بانگ تکبیر حسین

ذوق عریانی رہا جبتک بحال

فقر مومن سے ٹپکتا تھا جلال

دیر کہنہ یہ طلسم روز و شب　　اور تیغ لا سے خالی ہاتھ سب

کر کے غیر اللہ سے قطع نظر　　اس جہانِ کہنہ کو پھر زیر کر

غیرت دیں سے اگر دل ہے تہی　　آئینہ دار اجل ہے زندگی

مردِ حق پاتا ہے اک تازہ حیات　　نورِ حق سے دیکھتا ہے اپنی ذات

ہو کے پابند عیار مصطفیٰ

اک جہان تازہ کرتا ہے بنا

آہ تجھ سے کیا کہوں ملت کا حال　　خوں رلاتا ہے مجھے اسکا زوال

گرچہ ہے بہتات میر و شاہ کی — ہے مگر درویش سے دامن تہی

ہے گلے میں میرے اشکوں کی کمند — اک قیامت ہے مرے سینہ میں بند

مسلم اک مدت سے ہے اندوہ گیں — آہ کوئی باخدا ملتا نہیں

دین کی قوت سے بدظن ہو گیا — کارواں کا اپنے رہزن ہو گیا

تین[لے] صدیوں سے یہ ہے ملت کا حال — زندہ ہے بے شوق و سوز و جذب و حال

پست فکر و دوں نہاد و کور ذوق — مکتب و ملا ہے اک محروم شوق

زشتی اندیشہ سے خوار و زبوں — افتراق باہمی سے سرنگوں

جب رہا اپنی خودی ہی سے حجاب — مر گیا سینہ میں ذوق انقلاب

الغرض بے صحبت مرد خبیر — دل ہے اس کا کج رو حق ناپذیر

لے یعنی حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد سے جنھوں نے دور اکبری میں الحاد دینی کے خلاف جہاد کیا۔

اک غلام آقا کا ٹھکرایا ہوا زندگی سے اپنی تنگ آیا ہوا
بے زری سے دوش سلطانی پہ بار ظلمتوں سے اسکی شیطاں کو بھی عار
شیخ ملت پیر مغرب کا مرید ہے زباں پر گرچہ ذکر بایزید
شان محکومی سے ان کے دین کی زندگانی ان کی محروم خودی

دولت اغیار پر ان کی نظر
عمر کی طوف کلیسا میں بسر

اے کہ دل تیرا ہے بے سوز دروں تجھ سے جورِ عصر حاضر کیا کہوں
آپ سے مستور ہمکو کر دیا مصطفےٰؐ سے دور ہمکو کر دیا
دل سے عشق مصطفےٰؐ جاتا رہا جوہر اس آئینہ کا جاتا رہا
سحر تھا یا عصر حاضر کا قمار ہار دی اپنی خودی پہلی ہی بار

آگیا جب اسکی چالوں میں دماغ — بجھ گیا دل میں تمنا کا چراغ

کر کے دم بھر غیر سے قطع نظر — احتساب نفس کر اے بے خبر

تا کجا وسواس و خوف و غم سے کام — اس جہاں میں جان لے اپنا مقام

آشیاں کوہیں بہت شاخ بلند — کیوں نگوں شاخوں کو کرتا ہی پسند

ساز نغمہ ریز ہے تیرا گلا — صحبت زاغ و زغن سے کر ابا

دے کے تیزی خنجر و شمشیر کی — سونپ دے تقدیر کو اپنی خودی

تیرا باطن ایک سیل بے پناہ — جس کے آگے کوہ بھی ہی مثل کاہ

سیل کا بے تابیوں سے ہی بھرم — ہے سکون یک نفس اس کا عدم

میں نہ مُلّا نے فقیہ نکتہ ور — ہے نہ مجھ کو فقر و مستی کی خبر

راہ دیں میں تیز بین و سست گام — میری ہستی خام کار و ناتمام

ہاں دل بیتاب سے ہوں بہرہ مند ہے کھلا اک در، ابھی سو در ہیں بند

میرے سوز و ساز سے ہو بہرہ گیر

آئیگا مجھ سا نہ اب مردِ فقیر

مردِ حُر

مردِ حُر میدان میں ہے سر بکف — اس کے بازو میں ہی زور لاتخف[1]

اس کے سینہ میں ہے نور لاالٰہ — اس کی ہمت بے نیاز میر و شاہ

اس کے شانے خندہ زن ہر بار پر — اس کے تلوے طعنہ زن ہر خار پر

پاؤں رکھتا ہے کچھ اس انداز سے — ذرّے جاگ اٹھتے ہیں سوز و ساز سے

ساز و برگ زندگی ہے اسکو موت — اسکی تکبیریں ورائے حرف و صوت

سنگ رہ اسکی نظر سے ہے زجاج[2] — بادشاہوں سے وہ لیتا ہی خراج

---

[1] لاتخف :- تلمیح آیت قرانی کی طرف یعنی خوف نہ کر

[2] زجاج :- شیشہ

تیری شادابی اسی کے نم سے ہے
گرمیٔ محفل اسی کے دم سے ہے

اللہ اللہ ہیبت عریاں فقیر
خوف سے لرزاں ہیں شاہوں کے سریر

راز دیں ہم کو خبر، اس کو نظر
وہ درون خانہ، ہم بیرون در

ہم کلیسا دوست ہم مسجد فروش
مصطفےٰ کے ہاتھ سے وہ بادہ نوش

بے مغاں، بے جام وہ سرشار و مست
ہم تہی پیمانہ، وہ مست الست

چہرۂ گل اس کے نم سے تابناک
آگ سے رخشندہ تر ہے اسکی خاک

اس کے سینہ میں ہے تکبیر امم
اس کی پیشانی میں تقدیر امم

قبلہ اپنا گہ کلیسا گاہ دیر
وہ نہیں منت گذار دست غیر

ہم اسیر قید زنار فرنگ
کشتۂ چشم فسوں کار فرنگ

عبد رب وہ بندہ مولیٰ صفات
ذات اس کی ماورائے شش جہات

رات دن ہم کو تلاش ساز و برگ — آخری انجام تلخی ہائے مرگ

ہے اسی کو بزم عالم میں ثبات — موت بھی ہے اسکو اک تازہ حیات

ہے ہماری محفلوں سے مضمحل — خاک اسکے فیض سے دار آئے دل

ہم اسیر حلقۂ تخمین و ظن — وہ ہمہ کردار لیکن کم سخن

ہم گدا ہیں کوچہ گرد و فاقہ مست — فقر اس کا لاالٰہ سے تیز دست

ہم مثال کاہ رحم باد پیر — ضرب اس کی خندہ زن فولاد پر

اسکا محرم بن ہمارے در سے بھاگ — صاحب خانہ ہو دیکھے گھر کو آگ

کیوں ہے تو شکوہ گزار زندگی — مانگ لے اس سے شرار زندگی

اس کتابی علم پر نازاں ہی کیا — صحبت مردان حر ہے کیمیا

آب جو سے وہ نہیں منت پذیر — بحر بے پایاں سے ہے وہ فیض گیر

سینہ ہے اس کا تپاں مانند دیگ
ہے پہاڑ اس کی نظر میں مثل ریگ

صلح میں وہ سازو برگ انجمن
صورت باد بہاری خندہ زن

جنگ میں وہ محرم راز قضا
سامنا کرتا ہے ہنس کر موت کا

ہاں ہمارے سایہ سے بھی کر حذر
اس کے دامن سے لپٹ جا دوڑ کر

تخم دل پاتا نہیں نشو و نما
ہو نہ جبتک فیض مردان خدا

راز رفعت کے نہ ہونگے بے نقاب
ہو کسی در سے نہ جبتک انتساب

اسرار شریعت

پیر رومی سے کھلے مجھ پر وہ راز — دل ہے میرا جن سے وقف سوز و ساز

'مال را گر بہر دیں باشی حمول — "نعم مال[1] صالح" گوید رسول'

گر نہ اس حکمت پہ ہو تیری نظر — تو ہے بندہ اور مالک سیم و زر

ہے تہی دستوں سے قوموں کی کشاد — ایسے منعم وجہ صد گونہ فساد

ہر نئی چیز انکی نظروں میں ہی خوار — ہیں قدامت پر وہ کورانہ نثار

[1] نعم مال صالح :۔ حدیث نبوی، مطلب یہ ہے کہ اگر مال و دولت دینی امور پر خرچ کرنے کے لئے جمع کیا جائے تو وہ مال صالح ہے۔

ہر صواب ان کی نظر میں ناصواب — دشمن ہنگامہ ہائے انقلاب

بیکسوں کے مال پر ہے ان کا زور — دختر مزدور کی عصمت کے چور

انکے ظلموں سے ہیں بیکس مثل نے — صرف فریاد و فغان پے بہ پے

بانی عیش اور تہی جام و سبو — قصر کا معمار اور خود کو بہ کو

اے خوشا وہ منعم فقر آشنا

ہے جسے اس عہد میں خوف خدا

ہو نہ جبتک محرم اکل حلال — ہے جماعت پر تری ہستی وبال

کیا خبر یورپ کو کیا ہی یہ مقام — ہے مئے عرفاں سے خالی اسکا جام

خیر و شر سے بے خبر اسکا عیار — اسکی حکمت خام اور ناپختہ کار

ناتواں قوموں کو کھانا اس کا کام — خون سے دہقاں کے لبریز اسکا جام

اس کی حکمت بے کسوں کی رہزنی　　ناتواں جسموں پہ مشق جاں کنی

شیوۂ تہذیب ہے آدم دری　　پردۂ آدم دری، سوداگری

بینک، یہ ثمرہ یہودی فکر کا　　لے گئے سینوں سے انوار خدا

ہو تہ و بالا نہ جب تک یہ نظام

دانش و تہذیب و دیں، سودائے خام

اس جہان خیر و شر میں آدمی　　راہ کی رکھتا نہیں کچھ آگہی

زشت و خوب کار سے ہے بے خبر　　جادۂ ہموار سے ہے بے خبر

زیست کی گہرائیوں سے یک بیک　　شرع دکھلاتی ہے نورانی جھلک

شرع پر تعمیر ہو گر یہ نظام　　ہو نہ لغزش اس میں تا روز قیام

یہ فقیہوں کا نہیں فرسودہ جال　　کہتی ہے کچھ اور ہی یہ قیل و قال

شرع کیا ہے عدل و تسلیم و رضا
منبع اس کا ہے ضمیر مصطفیٰ

ہے دلوں میں آرزو کا پیچ و تاب
ہم کہاں ہوں "وہ" اگر ہو بے حجاب

ضبط ہر چند آتش پنہاں نہ ہو
ہو رضا جو، وصل کا خواہاں نہ ہو[1]

مصطفیٰ سے پوچھ لے اسکی رضا
ہے یہی امر شریعت کی بنا

تخت جم پنہاں ہے زیر بوریا
فقر و شاہی ہیں مقامات رضا

حکم سلطانی پہ چل بے قیل و قال
بزم کے خوگر یہ ہے وقت جدال

حکم سے مالک کے سرتابی نہ کر
تا کہ ہوں محکوم تیرے بحر و بر

شرع پہ چل احسن التقویم بن
وارث ایمان ابراہیم بن

---

[1] یہ اقبال کے تصوف کا بنیادی نظریہ ہے جو ان کو بعض ہندی اور ایرانی صوفیوں سے ممتاز کرتا ہے

ہے طریقت کیا؟ اصول شرع کا — زیست کی گہرائیوں میں دیکھنا

ہے تلاش راز دیں تجھ کو اگر — اپنے دل کی خلوتوں پر رکھ نظر

یہ نہیں تو دین مجبوری ترا — سنگ حائل ہے خدا کی راہ کا

بندہ پر جبتک نہ ہو حق آشکار — ہے اسیر بند و جبر و اختیار

ہو ذرا فطرت میں اپنی غوطہ زن — مرد حق بن، چھوڑ یہ تخمین و ظن

تا ہو رازِ خیر و شر تجھ پر عیاں — منکشف ہو جائیں اسرار نہاں

سرِّ پیغمبر سے ہے جو بہرہ گیر — ہے وہ جبریل امیں کا ہم صفیر

اے کہ تجھ کو ناز قرآن عظیم — حجرہ میں کبتک رہے گا تو مقیم

اٹھ جہاں والوں کو راز دیں بتا — نکتۂ شرع مبیں ان کو سکھا

ہو نہ محتاجی کسی کو غیر کی — نکتۂ شرع مبیں ہے بس یہی

مکتب و مُلّا کا افسوں الاماں — ہو گیا مومن سے یہ نکتہ نہاں

قوم یہ تاویل سے مردہ ہوئی — آتش اس کے دل کی افسردہ ہوئی

میں نے دیکھے صوفیان باصفا — شیخ مکتب کو بھی پرکھا بارہا

کیا کہوں جدت طرازی عصر کی — اک "پیمبر" کو بھی دی جلوہ گری

روح قرآں سے جو نامحرم رہا — دیکھی اس آئینہ میں اپنی ادا

یہ علمبردار قرآن و خبر — شرع میں ہیں کم سواد و کم نظر

عقل و نقل آلودۂ بند ہوس — ان کا مذہب اک تجارت اور بس

اوج ملت ان "کلیموں" سے نہیں — بے ید بیضا ہے ان کی آستیں

چاکِ ملت یوں نہیں ہوتا رفو

ہاں دکھا اعمال سے حق پر ہے تو

ہندیوں کے افتراق پر چند آنسو

اے ہمالہ اے اٹک، اے رودِ گنگ! ۔۔۔ تا کجا یہ زندگی بے آب و رنگ
پیر کہنہ بے فراست بے شعور ۔۔۔ نوجوانوں کے دل الفت سے ہیں دور
شرق و غرب آزاد، ہم نخچیرِ غیر! ۔۔۔ ہے ہماری خشت اور تعمیر غیر!
دوسروں کے رحم پر ہے زندگی ۔۔۔ خواب تو کیا، ہی یہ مرگ دائمی
یہ اجل افلاک سے آتی نہیں ۔۔۔ اس کا مخزن ہی یہی جانِ حزیں
صید اس کا بے نیاز نوحہ زن ۔۔۔ چلتی پھرتی لاش بے گور و کفن
اس کے غم میں کوئی دل مضطر نہیں ۔۔۔ دوزخ اس کا آسمانوں پر نہیں

انتظارِ حشر کیا اس کے لئے ہے یہی روزِ جزا اس کے لئے

جو کیا اسکا یہیں ملتا ہے پھل رکھ نہ فردا پر مکافاتِ عمل

آرزو سے دل نہیں ہے جس کا خون فطرت اس ملت کو کرتی ہے زبوں

ساحری پر ہے بنائے تاج و تخت ساحری سے ہے یہ شیشہ سنگ سخت

سحرِ مغرب کی یہ تھی جادو گری کافری باقی نہ دینداری رہی

چھڑ گئی پیکار پھر باہم دگر کھل گئے پھر فتنۂ کہنہ کے در

دیکھ کر پیکارِ کفر و دیں کا رنگ بن کے ثالث آ گئی قومِ فرنگ

دے گیا دھوکہ نگاہوں کو سراب

انقلاب! اے انقلاب! اے انقلاب

اے گرفتارِ فریبِ آب و گل اپنے رب سے مانگ لے اک زندہ دل

ایسا دل ہی جس کا مسکن یہ جہاں — حکم میں اسکے مگر نہ آسماں

پاک ہی اسکی سرشت اس خاک سے — اسکی منزل ہی پرے افلاک سے

یہ جہاں اسکو حریم کوئے دوست — ہی قبائے گل اسے ہمپوئے دوست

ہر نفس اس کو زمانہ سے ہے جنگ — ریزہ ریزہ ضرب سے اسکی ہی سنگ

ہر سر منبر کبھی بالائے دار — آتش پنہاں سے ہر دم بے قرار

آب جو، طوفاں لئے آغوش میں — بحر بے پایاں لئے آغوش میں

زندہ و پائندہ بے آب و غذا — "بے حضوری" اسکو پیغام فنا

شمع تابان شبستان بدن — خلوت و جلوت میں ہر دم ضو فگن

ایسا دل اللہ مست و خود شناس — پائیگا تو مرد کامل ہی کے پاس

اس کے دامن سے لپٹ جا اے جواں، — توڑ محکومی کا یہ طوق گراں

سیاسیات حاضرہ

کرتی ہے بند غلامی سخت تر　　حرّیت کہتا ہی اسکو بے بصر

شور جب دیکھا بہت جمہور کا　　دی ملوکیت کو جمہوری قبا

جامع اقوام کا دیکر خطاب　　سلطنت پر ڈال دی دلکش نقاب

اڑنے کو ناسازگار اس کی فضا　　درد انساں کی نہیں اس میں دوا

دیتی ہے مرغ قفس کو مشورا　　"آشیاں صیاد کے گھر میں بنا"

"وسعتِ صحرا سے لازم ہے حذر　　ہر گھڑی ہے باز دشاہیں کا خطر"

تھا فسوں سازی کا اسکی یہ اثر مرغ زیرک دانہ مست و بے خبر

بھول بیٹھا فطرت آزاد کو چھوڑ بیٹھا نالۂ فریاد کو

ہوشیار اے عاقل اسکے دام سے کر لبوں کو تر نہ اسکے جام سے

اسکی پہلو دار باتوں میں نہ آ گرمیٔ گفتار سے دھوکہ نہ کھا

اس کا سرمہ دشمنِ نورِ بصر اس کا دامن خون آزادی سے تر

الاماں اس کی شرابِ دلربا الحذر اس کا قمارِ غم فزا

کر نہ دے افیون مغرب اسکو خوار مرد حر اپنی خودی سے ہوشیار

پھر ہوا تازہ وہی سحرِ قدیم

ہاں دکھا دے ہیتِ ضربِ کلیم

کارواں کے حال پر ہوں نوحہ خواں رہبروں کے دل ہیں بے انوارِ جاں

تن پرست و جاہ مست و کم نگہ — ان کا دل محروم سوز لا الٰہ

ہے حرم کی خاک سے نسبت مگر — ہے کلیسا کی طرف ہر دم نظر

ان کے ہاتھوں غیرت دیں سوگوار — پردۂ ناموس ملت تار تار

پیروی کرنا ہے ان کی ابلہی — ان کے سینے قلب روشن سے تہی

ہے خود آگاہی سعادت کی کلید — کور سے کیا رہنمائی کی امید

حیف اس ملت پہ جس نے بیچ دی — جب غیر اللہ میں اپنی خودی

جب خودی کا بجھ گیا دل میں شرار — اٹھ گیا دنیا سے ملت کا وقار

دل میں تھی گو لا الہ کی روشنی — اک مسلماں بھی نہ پیدا کر سکی

بخشتا جو بے یقینوں کو یقیں — جس کے سجدے سے لرز اٹھتی زمیں

لا الٰہ کہتا جو ہنگام وغا — خون سے جسکے یہی آتی صدا

اب وہ سوز و ساز مشتاقی کہاں　　اب حرم میں اہل دل باقی کہاں

اے مسلماں توڑ یہ بند کہن　　تا کجا محصور قید اہرمن

مانگ وقت نیم شب با صد نیاز　　جہد کی لذت طلب کا سوز و ساز[1]

مثل خس کب تک لگا ہیں موج پر

کوہ بن ضبط نفس سے بے خبر

گرچہ دانا راز دل کہتا نہیں　　تجھ سے کیا پردہ ہی سن اے ہم نشیں

ہے ملوّث دل غلامی سے مرا　　ہوں حرم کی راہ سے بھٹکا ہوا

مصطفٰے پر بھیجتا ہوں جب درود　　ہوتا ہے غرق خجالت یہ وجود

عشق کہتا ہے کہ اے محکوم غیر　　تیرا سینہ ہی تبوں سے مثل دیر

---

[1] دعا اقبال کی نظر میں جہد و طلب کے منافی نہیں۔ سوز و ساز، نیم شبی، خود اخلاص جستجو کا ضامن ہے۔

تجھ میں ان کا سا نہیں جب رنگ و بو

ان کا نام آلودہ کیوں کرتا ہے تو"

بے حضورِ قلب ہی میری نماز — میرا سجدہ بے سرور و سوز و ساز

جلوۂ حق گرچہ ہو اک دو نفس — قسمت مردانِ حُر ہے اور بس

مردِ حُر ہوتا ہے جب وقفِ سجود — گرد اسکے پھرتا ہے چرخِ کبود

ہم غلاموں میں جلال اسکا کہاں — وہ جمالِ لازوال اس کا کہاں

حافظِ قرآں کبھی ہو محکوم اگر — لذتِ ایماں سے ہوگا بے خبر

مومن اور پیشہ ہے اس کا آذری — دین و عرفاں اس کا رہن کافری

ہے بدن میں تیرے گر سوزِ حیات — مژدۂ[1] معراج ہی تیری صلوٰت

---

[1] مژدۂ معراج الخ! صحیح ہے حدیث حضور رسالتمآب کی طرف، جس کا مطلب یہ ہے کہ نماز معراج ہے مرد مومن کے لئے۔

ہے جو خون گرم سے خالی بدن سجدہ ہے تیرا بس اک رسم کہن

عید آزاداں شکوہ ملک و دیں

عید محکوماں ہجوم مومنیں

اُمتِ عربیہ سے خطاب

اے ترے دشت و جبل پر حشر تک سر جھکائے عجز سے پیرِ فلک

کس نے دنیا میں کیا اے ارجمند نعرۂ لا قیصر و کسریٰ بلند؟

اس جہانِ آب و گل میں سچ بتا پہلا حامل کون تھا قرآن کا؟

روشن الا اللہ سے تھی کس کی جاں یہ چراغِ اول جلایا تھا کہاں؟

لہ لا قیصر و کسریٰ :۔ تلمیح ہے۔ مشہور حدیث کی طرف۔ ھلک قیصر فلا قیصر بعدہ الخ (ترجمہ) کسریٰ ہلاک ہوا اور اب کوئی کسریٰ اس کے بعد نہ ہوگا۔ اس حدیث کے بیان کرنے سے اقبال کا مفہوم یہ ہے کہ اسلام کے بعد نظام کسرائیت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

علم و حکمت کا ہوا کس سے ظہور
کس کے سینے میں تھا "فاصبحتم"[1] کا نور

تھا یہ اک اُمّی لقب کا فیض سب
گل بدامن ہو گئی ریگ عرب

حرّیت شاداب اسی آغوش سے
فیض یاب امروز اسکے دوش سے

پیکر خاکی کو بخشا نور جاں
کر دیا آدم کی عظمت کو عیاں

ہر خداوند کہن اس سے خراب
اسکے نم سے شاخ کہنہ غنچہ یاب

گرمیٔ ہنگامۂ بدر و حنین
حیدر و صدیق و فاروق و حسین

جنگ میں وہ سطوت بانگ صلوٰت
اور وہ شان قرأت "والصّٰفّٰت"[2]

---

[1] فاصبحتم: تلمیح ہے آیہ قرآنی کی طرف "فاصبحتم بنعمتہ اخواناً" یعنی تم پہلے باہم دشمن تھے اب اللہ کے فضل سے باہم بھائی بن گئے (اشارہ ہے اسلامی اخوت کی طرف)

[2] والصّٰفّٰت:- سورہ قرآنی کا نام ہے۔ اس کے معنی ہیں "قسم ہے پرا باندھنے والے فرشتوں کی"۔ جنگ کے موقع پر اس سورت کی تلاوت میں لطیف اشارہ ہے مجاہدوں کی تنظیم اور صف بندی کی طرف۔

تیغ ایوبی[1] نگاہ بایزید[2] دونوں عالم کے خزانوں کی کلید

عقل اور دل مست ہیں جس سے وہ مے اختلاط ذکر و فکر روم و رے[3]

علم و حکمت شرع و دیں، نظم امور قلب بیتاب اور جان ناصبور

حسن عالم سوز الحمرا و تاج قدسیوں سے بھی جو لیتا ہے خراج

ہے یہ سب اسکے ہی جلووں کی ضیا ایک قطرہ اسکے بحر فیض کا

ظاہر اسکا جلوہ ہائے دلستاں باطن اسکا عارفوں سے بھی نہاں

---

[1] سلطان صلاح الدین ایوبی رحمت اللہ علیہ

[2] بایزید :- حضرت بایزید بسطامی جو مشاہیر اولیائے امت سے ہیں۔ صلاح الدین ایوبی اور بایزید بسطامی کے یکجا ذکر سے اشارہ ہے رسول اللہ کی ذات پاک اور تعلیمات میں فقر و سلطانی دونوں کے دوش بدوش ہونے کی طرف۔

[3] روم و رے :- اشارہ ہے جلال الدین رومی اور امام فخر الدین رازی کی طرف یعنی رومی کا دل اور ذکر بھی پیدا کیا اور رازی کی عقل اور فکر بھی۔

حمد[1] بے حد مر رسول پاک را

آنکہ ایماں داد مشت خاک را

حق نے تجھ کو تیغ براں کر دیا   ساربان تقدیر کا را کب بنا

بانگ تکبیر و صلوٰت و حرب و ضرب   تھا یہی غوغا بجات شرق و غرب

اب و تجند وبی کی رعنائی کہاں   اب تو ہی افسردہ دل، کاہیدہ جاں

دوسری قومیں ہوئیں گرم سفر   تو رہی صحرا سے اپنے بے خبر

امتوں میں بٹ گئی ملت تری   اپنے ہاتھوں مٹ گئی وحدت تری

مٹ گیا جس نے خودی کو چھوڑ کر   مرحمت کی غیر سے رکھی نظر

آہ کھودا تو نے خود اپنا مزار   روح پاک مصطفےٰ ہے بے قرار

[1] یہ شعر شیخ فرید عطار نے حمد خدا میں اسطرح لکھا ہے "حمد بیحد مر خدائے پاک را" الخ اقبال نے بہ تغیر لفظی اسکو نعت رسول میں استعمال کر دیا۔ مطلب یہ ہے کہ رسول پاک بے حد تعریفوں کے مستحق ہیں جن کی بدولت مشت خاک انساں کو نور ایمان عطا ہوا۔

تو فسونِ غرب سے واقف نہیں ہے بھری فتنوں سے اسکی آستین

حرّیت کی ہے تمنا گر تجھے ہانک دے اونٹ اسکے اپنے حوض سے

اسکی حکمت نے کیا قوموں کو خوار وحدتِ اعرابیاں اس کا شکار

پھنس گیا جب سے عرب اس دام میں مبتلا ہے گردشِ ایام میں

عصر کو دیکھ اپنے اے صاحب نظر پھونک اپنے جسم میں روحِ عمر

جمع کر پھر قوتِ دینِ مبیں دین کیا ہی عزم و اخلاص و یقین

مردِ صحرا کا ضمیر راز داں گنجِ فطرت کا امین و پاسباں

سادگی اسکی عیارِ زشت و خوب اُسکی آمد سے ہزار انجم غروب

چھوڑ یہ دشت و در و کوہ و دمن ہو خودی کی خلوتوں میں خیمہ زن

بادِ صحرا سے طبیعت جب ہو تیز موڑ دے رخ سوئے میدانِ ستیز

عصرِ حاضر تیرے خواں کا ریزہ خوار — اسکی مستی تیری مئے سے مستعار

شارحِ اسرار اس کا تو ہی تھا — اولیں معمار اس کا تو ہی تھا

جب سے پائی اس نے آغوشِ فرنگ — بن گیا اک شاہدِ بے نام و ننگ

گرچہ ہے شیریں ادا رنگیں کلام — ہے مگر بے دین و شوخ و بے خرام

مردِ صحرا! پختہ کر دے خام کو

کر دے سیدھا گردشِ ایّام کو

اقوامِ مشرق کیلئے راہِ عمل

آدمیت جورِ مغرب سے ہی تنگ — بن گئی ہے زندگی میدانِ جنگ

کیا ہے اب تدبیر اے اقوامِ شرق — پھر ہو روشن قسمتِ ایامِ شرق

رونما مشرق میں ہی اک انقلاب — جلوہ گر ہے پھر افق پر آفتاب

یورپ اپنی تیغ کا ہے خود شکار — رسمِ لادینی[1] سے ہے سینہ فگار

گُرگ ہے پہنے ہوئے بکری کی کھال — ہے شکارِ تازہ کی خاطر یہ جال

اس کی چالوں سے ہی دوزخ یہ جہاں — آدمیت اسکے ہاتھوں نوحہ خواں

---

[1] رسم لادینی :۔ یعنی امورِ ریاست میں دین سے بیزار ہو جانا۔

آدمی ہے ایک مشتِ گل اسے

زندگی اک راہ بے منزل اسے

ہوتے ہیں انوارِ حق ہی سے عیاں — حکمت اشیاء کے اسرار نہاں

دیکھتا ہے مومن آیات خدا — حکم اُنظُر[1] سے ہیں آنکھیں پر ضیا

ہے یہی مومن کی خوش بختی کا راز — ہے اسی سے رحم و الفت سوز و ساز

علم کی ہوتی ہے جس دل میں عنیا — اس میں ہوتا ہی سوا خوفِ خدا

علم اشیاء ہے جو ہمکو کیمیا — غرب میں تاثیر ہے اس کی جدا

ذہن اس کا بے عیار خوب و زشت — آنکھ بے نم، دل مثال سنگ و خشت

---

[1] حکم اُنظُر ! قرآن پاک میں جگہ جگہ آیات الٰہی کو دیکھنے اور ان پر غور کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو مومن کے لئے سرمایۂ بصیرت و عبرت ہے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے۔

الاماں وہ سحر آگیں علم و فن — جس کی صحبت سے ہو جبریل اہرمن

دانش مغرب وہ تیغ بے نیام — ہے ہلاک نوع انساں جسکا کام

سینۂ تاریک سفلوں کے کہاں — مستی علم و ہنر کے رازداں

آہ غرب و غم فزا آئین غرب — حیف وہ اندیشۂ لادین غرب

علم حق کو دی ادائے ساحری — دین و ایماں کو سکھائی کافری

ہر طرف ہیں سیکڑوں فتنے عیاں — چھین لے رہزن کی تیغ خوں فشاں

اے کہ روشن تجھ پہ جان و تن کا فرق — کر دے اس تہذیب لادینی کو غرق

پھونک دے اس سارمیں مشرق کی کے — ڈالدے اس جام میں طیبہ کی مے

اس کا دل ہے نور معنی سے تہی — کر عطا اسرار جاں سے آگہی

تابع فرمان دل ہے عقل اگر — سرّ یزدانی سے ہو وہ بہرہ ور

ہے اگر خود کام عقل ذو فنوں — دام میں ابلیس کے صید زبوں

زندگی میں ہر گھڑی ہے کشمکش — دیکھ عبرت سے ذرا حال حبش

شرع یورپ نے بغیر قیل وقال — کر دیا ہے گرگ کو برّہ حلال

نقش نو کی دہر میں بنیاد ڈال — توڑ کر رکھ دے کفن زردوں کا جال

کچھ جنیوا میں نہیں جز مکر و کید — ہے مرا نخچیر یہ وہ تیرا صید

دل میں ہیں وہ نکتۂ آشوب زا

تنگ ہے الفاظ کی جن پر قبا

اے اسیر رنگ و بوئے رنگ ہو — مومن خود کافر افرنگ ہو

رشتۂ سود و زیاں ہے تیرے ہاتھ — آبروئے خاوراں ہے تیرے ہاتھ

نغمۂ وحدت سنا اقوام کو — زندہ کر صدق و صفا کے نام کو

اہل حق کی زندگی قوت سے ہے　　قوت اقوام جمعیت سے ہے

رائے بے قوت ہے اک مکر و فسوں

قوت بے رائے ہے جہل و جنوں

ایشیا ہے مایہ دار سوز و داغ　　ایشیا ہے بزم ہستی کا چراغ

عشق کو ہم نے سکھائی دلبری　　ہے ہمیں سے شیوۂ آدم گری

منبع دین و ہنر یہ خاک ہے　　غیرت گردوں یہ ارض پاک ہے

ہم سے ہیں اسرار فطرت کے عیاں　　مہر سے ہم، ہم سے مہر ضو فشاں

گوہر آغوش صدف میں ہم سے ہے　　بحر میں طوفاں ہمارے دم سے ہے

سوز بلبل میں ہماری روح کا　　ہے ہمارے خوں سے گل رنگیں قبا

منکشف ہم نے کیا راز وجود　　نغمہ زن ہم سے ہوا ساز وجود

زندگی کی ظلمتیں تھیں بے چراغ — ہم نے روشن کر دیا سینہ کا داغ

اے امین دولت تہذیب و دیں! — کر فروزاں دل میں پھر شمع یقیں

خیل فرعونی سے پھر ہے معرکا — پھر ید بیضا کی تابانی دکھا

رزم ہستی کو ہے تیرا انتظار — نشۂ افرنگ کو سر سے اتار

پھر ہو اقوام جہاں کا چارہ ساز — پھر بتا فقر و جہانبانی کے راز

کر علم خاور کی وحدت کا بلند

توڑ دے یہ اہرمن کے قید و بند

الاماں چشم فسوں کار فرنگ — توڑ بھی یہ قید زنار فرنگ

زخم خوردہ اسکے نشتر کا ہے تو — ہے اسی سے پھر بھی امید رفو

جانتا ہے تو، ہے شاہی قاہری — قاہری ہے آج کل سوداگری

تختۂ دکّاں، شریکِ تخت و تاج — منفعت اس سے ہی اور اس سے خراج

یہ تجارت کرنے والے تاجور — ہے زباں پر اُنکی خیر اور دل میں شر

ہے اگر دل کو ترے فکرِ مآل — لے نہ کوڑی کے عوض بھی اسکا مال

لب پہ بھی آجائے گو جانِ حزیں — لے زمستاں میں نہ اسکی پوستیں

مارنا بے حرب و ضرب اسکا شعار — ہیں مشینیں یا غریبوں کے مزار

دے کے پیدل اسکے فرزیں کو نہ لے — بوریئے کے بدلے قالیں کو نہ لے

موتی جھوٹے، لعل اسکے کم بہا — مُشک اس کا ناف سگ سے ہی بنا

خواب مخمل اسکا رہزن چشم کا — تیرا دشمن اسکا رنگ خوش نما

اسکے دامن میں ہیں سو فتنوں کے در — ریشمی دستار سے اس کی حذر

عاقل اسکے خُم سے مے پیتا نہیں — اور جو پی لیتا ہے وہ جیتا نہیں

وقت سودا خوش کلام و خندہ کوش
ہم ہیں طفل سادہ، وہ شکّر فروش

محرم قلب و نگاہ مشتری
ہے خدایا سحر یا سوداگری

ہم فریب رنگ و بو میں آ گئے
تاجر مغرب سے دھوکہ کھا گئے

غرب کے رنگین شیشوں پر نہ جا
جام و ساغر اپنی مٹی سے بنا

ہیں خودی کے راز سے جو آشنا
اپنے ہاتھوں بنتے ہیں اپنی ردا

عصر حاضر کا نہیں تو رازداں
دیکھ تو یورپ کی چابک دستیاں

بن کے اک قالین ریشم سے ترے
تیرے ہی بازار میں بھیجا اسے

آنکھ ظاہر کے فسوں میں آ گئی
اس کی رنگینی سے دھوکہ کھا گئی

وائے تجربے خروش و کم نظر
مول جو غیروں سے لے اپنے گھر

حضور رسالتمآبؐ میں

اس نظم کی شان نزول یہ ہے کہ ۳؍ اپریل ۱۹۳۶ء کی شب میں دارالاقبال بھوپال میں اقبال نے خواب میں دیکھا کہ سید احمد خاں رحمت اللہ علیہ فرما رہے ہیں کہ "اپنی علالت کے متعلق حضور رسالتمآبؐ میں عرض کر د"

اے کہ تو ہم بیکسوں کا ساز و برگ
کر دلوں کو بے نیاز خوف مرگ

اے کہ تجھ سے بے نشاں لات و منات
تجھ سے تازہ رونق بزم حیات

تجھ سے روشن ذکر و فکر انس و جاں
تو صلوٰت صبح تو بانگ اذاں

روح میں تجھ سے سرور لا الہ
فکر کی ظلمت میں نور لا الہ

گاو خر کو ہم نے رب سمجھا نہیں
اور نہ پیش کاہناں خم کی جبیں

ہم سے غم دیدہ ہیں معبودان پیر
کی نہ ہم نے بندگی شاہ و میر

فیض تھا یہ تیری ہی تعلیم کا — فکر مسلم ہے تجھی سے پر ضیا

ذکر تیرا مایۂ ذوق و سرور — فقر میں رکھتا ہے ملت کو غیور

اے مقام و منزل ہر راہرو — تجھ سے روشن ہے دل ہر راہرو

آہ ساز اپنا کہاں اب نغمہ بار — زخمہ بھی تاروں کو اب ہے ناگوار

میں نے دیکھے ہند و ایران و عرب — مصطفےٰ نایاب و ارزاں بولہب

یہ مسلماں زادۂ روشن دماغ — ہے دل تاریک اسکا بے چراغ

جوں حریر اسکا شباب نرم خو — دل گرفتار تبان رنگ و بو

دل میں اس کے آرزو زار و نزار — ایک دم بھر کی جھلک مثل شرار

یہ غلام ابن غلام ابن غلام — حریت افکار پر اس کے حرام

لے لیا مکتب نے اس سے جذبہ دیں — ہو گئی سینہ میں گل، شمع یقیں

یہ خودی بیگانہ، مغرب کا شکار — غرب سے ہی نانِ جو کا خواستگار

آہ اس کے غم سے ہوں میں سینہ چاک — ناں خریدی اس نے دیکر جانِ پاک

دانہ چیں مانند مرغانِ سرا — ہے فضائے چرخ سے نا آشنا

شیخ مکتب کم سواد و کم نظر — اسکے درجے سے نہ دی اس کو خبر

نارِ مغرب سے یہ لوہا گل گیا — اک نئے سانچے میں گویا ڈھل گیا

مومن اور رمزِ فنا سے بے خبر — شک اسے "لاغالب الا اللہ" [۱] پر

آرزو سے اس کا سینہ بے خروش — ہر گھڑی ہے اسکو فکرِ نائے و نوش

ایک روٹی کیلئے اس درجہ خوار — اک شکم کے واسطے یہ ننگ و عار!

لیتا ہے افرنگ سے لات و منات — مومن اور اندیشہ اس کا سومنات

۱؎ لاغالب الا اللہ :- یعنی اللہ کے سوا کوئی غالب نہیں

"قم باذنی[1]"، کہکر اس کو زندہ کر
نور حق سے اس کا دل تابندہ کر

ہم تمام افسونیٔ تہذیب غرب
کشتۂ افرنگ ہیں بے حرب وضرب

منتشر ہیں جس کی ہستی کے ورق
پھر اٹھا اس قوم سے اک مرد حق

کر مسلماں کی خودی اس پر عیاں
پھر ہو مسلم سرفراز دو جہاں

روک لے دم بھر عناں اے شہسوار
لب پہ آنے کو ہیں ارماں بیقرار

ضبط دل اب مجھ سے ہوتا نہیں
شوق محکوم ادب ہوتا نہیں

شوق کہتا ہے کہ غافل کھول لب
ضبط کہتا ہے رہے پاس ادب

اے کہ تیری ذات مقصود حیات
اس طرف بھی اک نگاہ التفات

---

[1] قم باذنی ! یعنی اٹھ میرے حکم سے

میرے ذکر و فکر کا حاصل ہے تو
علم و عرفاں کی مرے منزل ہے تو

زندگی کا میری ساماں تجھ سے ہے
کشتی و دریا و طوفاں تجھ سے ہے

ناتوان و زار اک صید حزیں
درخورِ فتراک بھی جو اب نہیں

ڈھونڈھتا ہے تیرے دامن میں پناہ
مرحمت کی تجھ سے رکھتا ہے نگاہ

ساز میں میرے کہاں اب وہ نوا
جس سے دل ہو جاتے تھے غنچوں کے وا

گھُٹ[1] گئے نغمے گلے کے ساز میں
چھپ گئے شعلے حجابِ راز میں

آہ سے سوزِ جگر جاتا رہا
لطفِ قرانِ سحر جاتا رہا

ضبطِ غم سے ہوں بہت میں دردمند
سینے میں کب تک رہیں نالے یہ بند

---

[1] آخری علالت کے سلسلے میں اقبال مرحوم کا گلا بیٹھ گیا تھا۔ اسی کی طرف اشارہ ہے۔

اک فضائے بے کراں ملتی نہیں
وسعتِ نُہ آسماں ملتی نہیں

جان و تن میں ہے مرے جو سوزِ غم — ہے دوا اسکی تری چشم کرم

ہوں میں وہ بیمار زار و خستہ جاں — جس پہ ہو تلخی دواؤں کی گراں

مجھ کو ہے اپنی دوا سے دشمنی — کر رہا ہوں پرورش آزار کی

ڈھونڈھتا ہوں لذت کام و دہن — زیرِ لب ہے چارہ فرما خندہ زن

تجھ سے ہوں مثل بصیریؒ[1] داد خواہ — کردے روشن میری شبہائے سیاہ

عاصیوں پر ہے فزوں تیری عطا — عفو میں تو مہرِ مادر سے سوا

شب پرستوں سے ہوں میں وقفِ ستیز — کردے شمع زندگی کی لَو کو تیز

---

[1] امام بوصیریؒ۔ مشہور عربی قصیدہ بُردہ کے مصنف۔ یہ قصیدہ حضور رسالتمآب کی نعت میں ہے۔ روایت ہے کہ بوصیری کا قصیدہ بارگاہ نبوی میں مقبول ہوا اور مصنف کو فالج کی بیماری سے نجات ملی۔

اے کہ تیرا جلوہ نورِ کائنات
کر دے اپنی ضو سے روشن میری رات

"خود بدانی[1] قدرِ تن از جاں بود
قدرِ جاں از پرتوِ جاناں بود"

غیر حق سے تا نہ ہو چشمِ امید
یا مجھے شمشیر کر دے یا کلید

فہم دیں میں تیز ہے میری نظر
دل نہیں جوشِ عمل سے بہرہ ور

کر روانی میرے تیشہ کو عطا
کوہکن سے ہے مری محنت سوا

ہوں مسلماں دل سے، میں کافر نہیں

ہاں پرکھ کر دیکھ بد گوہر نہیں

عمر گو بے فائدہ گزری تمام
اک گہر رکھتا ہوں دل ہی جسکا نام

ہے جو تیری خاکِ پا سے ضو فشاں
سینہ میں رکھا ہے دنیا سے نہاں

---

[1] رومی کا شعر ہے (ترجمہ، تو خود جانتا ہے کہ جسم کی قدر و قیمت جان کی وجہ سے ہے اور جان کی قدر عکس محبوب کی وجہ سے۔

میں نہیں رکھتا ہوائے ساز و برگ
زندگی ہے بے ترے ہم رنگ مرگ

کُرد کو تو نے دیا سوزِ عرب
اپنی خدمت میں مجھے کر لے طلب

سوزِ غم سے داغ ہیں قلب و جگر
دوست میرے درد سے ہیں بے خبر

ہر گھڑی فریاد پر مائل ہوں میں
خود ہی اپنی تیغ کا بسمل ہوں میں

دشت میں ہوں مثل چوب نیم سوز
کاروان رفتہ کے غم میں ہنوز

ہوں اسی غم میں مَیں زار و خستہ جاں
کاش گزرے اور کوئی کارواں

پھنک رہے ہیں ہجر میں جان اور تن

وائے من! اے وائے من! اے وائے من

ملنے کا پتہ

ظفر احمد صدیقی

شعبۂ فلسفہ و نفسیات

مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ

یا

یونیورسٹی پبلشرز

مسلم یونیورسٹی مارکیٹ ۔ علیگڑھ

ناشر
یونیورسٹی پبلشرز
مسلم یونیورسٹی علیگڑھ